حکومت بہار
اردو ڈائرکٹوریٹ
بہار، پٹنہ

سلسلہ نمبر-۱۳

انجم مانپوری

ڈاکٹر سید احمد قادری

Monograph-13

Anjum Manpuri

By : Dr. Syed Ahmad Qadri

انجم مانپوری نے اردو ادب میں ایک طنز ومزاح نگار، ایک شاعر اور ایک صحافی کی حیثیت سے ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے۔ لیکن وہ بنیادی طور پر ایک کامیاب طنز ومزاح نگار ہی تھے۔ اردو ادب میں جن ادیبوں نے طنز ومزاح کے میدان میں اپنی فنکاری کے نمایاں جوہر دکھائے ہیں ان میں انجم مانپوری کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انجم مانپوری کے نظریے کے مطابق طنز ومزاح ایک نازک اور اعلیٰ فن ہے، جس کا مقصد کسی کی عیب جوئی یا تضحیک نہیں ہے۔ بلکہ اس کا منصب سماج یا معاشرے کو اس طور سے آئینہ دکھانا ہے کہ ہمیں اپنی کمیوں اور خامیوں کا غیر محسوس طریقے سے احساس ہو جائے اور دل مائل بہ اصلاح ہو۔ انجم مانپوری اپنے کرداروں کی تخلیق اس طور سے کرتے ہیں کہ وہ ہمارے سماج، زوال آمادہ تہذیب، بیمار معاشرے کا آئینہ بن جاتے ہیں اور ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

انجم مانپوری کا اصل نام نور محمد تھا۔ وہ سنجیدہ کلام کے لئے انجم اور مزاحیہ تخلیق کے لئے مانپوری تخلص اختیار کرتے تھے۔ ان کے فن میں غضب کی ذہانت اور گہرے مشاہدے کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ انجم مانپوری کی پہلی طنزیہ ومزاحیہ تخلیق ''میر کلو کی گواہی'' جب اگست۔ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی تو پوری ادبی دنیا میں اس کی گونج سنی گئی اور پورے ملک میں ان کا شہرہ ہو گیا۔ ان کی اس تخلیق نے انہیں شہرت اور مقبولیت کے اس بامِ عروج تک پہنچا دیا کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اہل نظر کہتے ہیں کہ اگر انجم مانپوری ''میر کلو کی گواہی'' کے علاوہ کچھ اور نہ لکھتے تو بھی یہ ان کی ادبی بقا کا ضامن ہے۔ میر کلو ان کا ایک ایسا لافانی کردار ہے، جس کی گونج آج ۹۰ سال بعد بھی سنائی دے رہی ہے۔ یہ ایک غیر معمولی کارنامہ ہے، جو انجم مانپوری کو ان کے ہم عصروں شوکت تھانوی، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ چغتائی اور فرحت اللہ بیگ جیسے بلند قامت طنز ومزاح نگاروں کے درمیان منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔

''میر کلو کی گواہی'' کی بے مثال کامیابی اور پذیرائی کے بعد انجم مانپوری کے باغ و بہار قلم نے مسلسل طنز ومزاح کے پھول کھلائے اور ان کے کئی مجموعے منظر عام پر آتے رہے، جن میں طنزیات مانپوری (حصہ اول)، طنزیات مانپوری (حصہ دوم) مطائبات مانپوری اور ''مرنے کے بعد'' شامل ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ بھی ''کلام انجم'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ ایسے ادبی سرمائے ہیں جو اردو ادب کے خزانے میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

انجم مانپوری ایک اچھے صحافی بھی تھے۔ انہوں نے صحافت کے میدان میں بھی اپنی صلاحیت کے جوہر دکھائے اور اس کے توسط سے انہوں نے ملک کی جنگ آزادی میں بھی حصہ لیا۔ ۱۹۱۴ء میں انجم مانپوری نے گیا سے ایک نیم مذہبی رسالہ ''رہنما'' نکالا۔ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے مولانا ظفر علی خاں کے انقلابی اخبار ''زمیندار'' میں نائب مدیر کی ذمہ داری نبھائی۔ جون ۱۹۴۱ء میں انہوں نے گیا سے ''ندیم'' نامی معروف رسالہ جاری کیا۔ اس کا ''بہار نمبر'' آج بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر سید احمد قادری کا نام اردو افسانہ نگاری، تبصرہ نگاری، صحافت، تنقید، تحقیق اور تاریخ کے شعبے کا شہرت یافتہ، معتبر اور مقبول نام ہے۔ بہار کی اردو تحریک سے ان کا بڑا ہی گہرا اور طویل رشتہ رہا ہے۔ اردو صحافت میں بھی ان کا نام وقیع اور مثالی ہے۔ ''اردو صحافت بہار میں'' اور ''اردو صحافی بہار کے'' ان کی ایسی تصانیف ہیں جسے قابل رشک کہا جا سکتا ہے۔ انجم مانپوری، سید احمد قادری کا ایک پسندیدہ موضوع ہے۔ انھوں نے اس فرد نامے میں مانپوری کی شخصیت اور فن کو بطریق احسن پیش کر کے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔

—اسلم جاوداں

प्रकाशक
उर्दू निदेशालय
मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

انجم مانپوری

ڈاکٹر سید احمد قادری

طابع وناشر:
اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔۱۳

Anjum Maanpuri

By

Dr. Syed Ahmad Quadri

نام کتاب	:	انجم مانپوری
مصنف	:	ڈاکٹر سید احمد قادری
سال اشاعت	:	2022ء
کل صفحات	:	136
کمپوزنگ/تزئین	:	منصور رضا، گیا/محمد سعید احمد
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	نیو فائن آرٹ آفسیٹ، درگاہ روڈ، پٹنہ۔٦

ملنے کا پتہ:
اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۱
فون نمبر : 0612-2530093، ای میل : directorurdu@gmail.com

فہرست

پیش لفظ	احمد محمود	4
ابتدائیہ	ڈاکٹر سید احمد قادری	6
انجم مانپوری ایک نظر میں	—	10
انجم مانپوری کی حیات	—	11
انجم مانپوری کی خدمات	—	21
انجم مانپوری بحیثیت طنز وظرافت نگار	—	24
انجم مانپوری بحیثیت شاعر	—	74
انجم مانپوری بحیثیت صحافی	—	85
اعتراف، اعتراض اور اعتبار	—	91
نمونۂ کلام	—	99
• غزلیں	—	100
• نظمیں	—	102
• رباعیات/قطعات	—	106
نمونۂ انشائیے	—	
• میر کلّو کی گواہی	—	109
• میری عید	—	114

پیش لفظ

دبستان لکھنؤ، دبستان دہلی اور دبستان دکن کی طرح اپنے مخصوص اور بیش قیمت شعری و ادبی روایت اور سرمائے کی بنیاد پر دبستان بہار بھی ایک اہمیت کا حامل ہے۔

سرزمین بہار میں شعروادب کی یکتائے زمانہ اور باکمال شخصیتیں ہر دور میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں اور اپنے کمالِ فن سے دنیائے ادب میں بہار کا نام روشن کرتی رہی ہیں۔

شادؔ عظیم آبادی، امداد امام اثرؔ، شوقؔ نیموی، فضلِ حق آزاد،، بیدل عظیم آبادی، انجم مانپوری، اختر اورینوی، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، کلیم عاجزؔ، مظہر امام، عبدالصمد، شوکت حیات، احمد یوسف اور شفیع مشہدی جیسی بے مثل اور یکتائے زمانہ ادبی شخصیتوں نے پوری ادبی دنیا میں بہار کی شعری و ادبی عظمت و اہمیت کا پرچم لہرایا اور دبستان بہار کو مضبوط شناخت عطا کی۔ دبستان بہار کی شعری و ادبی روایت اس قدر مقتدر اور وقیع ہے کہ دنیائے ادب اسے بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ دبستان بہار کی جملہ سرکردہ اور مقتدر ادبی شخصیتوں کی وقیع خدمات شعروادب کا اعتراف کرتا ہے۔ ان کے ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور اسے نئی نسل تک پہنچانا اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ نے گزشتہ دنوں دس مشاہیر ادب بہار ا۔ شادؔ عظیم آبادی، ۲۔ پرویزؔ شاہدی، ۳۔ کلیم الدین احمد، ۴۔ رضا نقوی واہیؔ، ۵۔ علامہ واقفؔ عظیم آبادی، ۶۔ عبدالمغنی، ۷۔ وہاب اشرفی، ۸۔ رمزؔ عظیم آبادی، ۹۔ شین مظفر پوری، ۱۰۔ کلیم عاجزؔ کے فردنامے (مونوگراف) شائع کرائے۔ ان فردناموں کا ادبی دنیا میں زبردست استقبال کیا گیا اور اردو ڈائرکٹوریٹ کی اس پیش کش کو اہم اور قیمتی قرار دیا گیا نیز مزید مشاہر دبستان بہار پر فردنامے کی اشاعت کا مطالبہ بھی گیا ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ نے دانشوران شعروادب کی ایک اہم مشاورتی نشست میں مشوروں کے

بعد اتفاق رائے سے مزید ۳۲ فردناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا۔ جن گراں قدر ادبی شخصیتوں پر فردناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا گیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

ا۔ امداد امام اثرؔ، ۲۔ فضل حق آزاد عظیم آبادی، ۳۔ شوقؔ نیموی، ۴۔ انجم مانپوری، ۵۔ یاس یگانہ چنگیزی، ۶۔ بیدل عظیم آبادی، ۷۔ قاضی عبدالودود، ۸۔ جمیل مظہری، ۹۔ اختر اورینوی، ۱۰۔ سہیل عظیم آبادی، ۱۱۔ شکیلہ اختر، ۱۲۔ حسن نعیم، ۱۳۔ غیاث احمد گدی، ۱۴۔ کلام حیدری، ۱۵۔ احمد یوسف، ۱۶۔ صدیق مجیبی، ۱۷۔ احمد جمال پاشا، ۱۸۔ اویس احمد دوراںؔ، ۱۹۔ لطف الرحمٰن، ۲۰۔ اسرار جامعی، ۲۱۔ جمیلہ خدابخش، ۲۲۔ رشیدۃ النساء، ۲۳۔ بیتاب صدیقی، ۲۴۔ قمر اعظم ہاشمی، ۲۵۔ راسخؔ عظیم آبادی، ۲۶۔ عبدالغفور شہباز، ۲۷۔ پیغام آفاقی، ۲۸۔ غلام سرور، ۲۹۔ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، ۳۰۔ مظہر امام، ۳۱۔ اجتبیٰ رضوی، ۳۲۔ کیف عظیم آبادی۔

انجم مانپوری بہار کے ایک بڑے طنز و مزاح نگار گزرے ہیں۔ فکر و فن میں ڈوبی ہوئی ان کی شگفتہ تحریر ہمیں مسکراہٹ کے ساتھ معاشرتی خامیوں کی اصلاح کی دعوت دیتی ہے۔ انھوں نے اپنی دلکش اور معنی خیز تحریروں کے ذریعہ کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔

ڈاکٹر سید احمد قادری اس فردنامے کے مصنف ہیں۔ وہ ایک افسانہ نگار، صحافی، محقق و ادیب کی حیثیت سے معروف ہیں۔ انجم مانپوری پر ان کی اور بھی تحریریں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ انھوں نے انجم مانپوری کا بڑی باریک بینی اور گہرے ادبی شعور کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ ان کا یہ فردنامہ انجم شناسی کے سلسلے میں ایک معتبر اور اہم تصنیف کی حیثیت کا حامل ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ کی یہ پیش کش باب انجم مانپوری میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

احمد محمود
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

ابتدائیہ

اردو طنز وظرافت کی دنیا میں انجم مانپوری کا نام کئی لحاظ سے اہم ہے۔ ان کا پہلا انشائیہ اگست 1931 میں ''میر کلّو کی گواہی'' جب شائع ہوا تھا اس وقت پورے متحدہ بھارت میں دھوم مچ گئی تھی۔ اس انشائیہ کی شہرت اور مقبولیت کے بعد مانپوری کو لوگ میر کلّو کی گواہی والے کے نام سے بھی یاد کرنے لگے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس انشائیہ نے مانپوری کو شہرت اور مقبولیت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ کئی لوگوں نے اس بات کا عتراف کیا ہے کہ اس انشائیہ کے بعد مانپوری اگر کچھ بھی نہیں لکھتے، تو بھی ان کا نام اردو طنز و مزاح نگاروں کی فہرست میں سر فہرست رہتا۔ گرچہ میر کلّو کا کردار اپنے معاشرے میں کوئی نیک نام اور سماجی اعتبار سے کسی اہمیت کا حامل نہیں، لیکن اس کردار نے اپنی بذلہ سنجی، ذہانت اور اپنے مکالموں کی شوخی سے ظرافت کا جو حسن پیدا کیا ہے، وہی دراصل اس پیشہ ور گواہ کی کامیابی تھی۔ اس کردار کا مانپوری کے عہد کے، کئی طنز و مزاح نگاروں کے خاص و مشہور کردار مثلاً رتن ناتھ سرشار کا کردار ''خوجی'' ڈپٹی نذیر احمد کا کردار'' ظاہر دار بیگ'' پطرس بخاری کا کردار ''مرزا صاحب'' شفیق الرحمٰن کا ''شیطان'' امتیاز علی تاج کا کردار ''چچا چھکن'' سجاد حسین کے ''حاجی بغلول'' وغیرہ سے موازنہ کیا گیا اور موازنے میں میر کلو کہیں پر بھی کمتر نظر نہیں آئے۔

اپنے اس مشہور مضمون (انشائیہ) ''میر کلّو کی گواہی'' کی شہرت اور مقبولیت سے مانپوری مطمئن ہو کر نہیں بیٹھے، بلکہ ان کا قلم رواں دواں رہا اور انھوں نے ''پاگل خانہ کی سیر، اڈیشنل وائف، سیکنڈ ہینڈ موٹر، میرا روزہ، میری عید، پنک آشرم، آنریری مجسٹریٹ، صاحب کا کتّا، میونسپل الیکشن، مرنے کے بعد وغیرہ جیسے انشائیے لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے مطالعہ و مشاہدہ سے اور اپنے فنکارانہ حسن و معیار سے طنز وظرافت کے مختلف رنگ و آہنگ کی ایک خوبصورت دنیا بسانے کی قوت رکھتے ہیں۔ مانپوری نے اپنے تمام انشائیوں میں سماجی و معاشرتی زبوں حالی، بداعمالیوں اور خامیوں کو اپنے مخصوص فنکارانہ سحر انگیزی، مکالموں کی اثر انگیزی اور متنوع کرداروں کی مختلف پہچان کے ساتھ ایسی

کیفیت پیدا کی ہے کہ پڑھنے والا کبھی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جائے اور کبھی طنز کی چبھن محسوس کرے تو اپنے ارد گرد کی معاشرتی خامیوں، زمانے کی زبوں حالی اور انحطاط پذیر سماجی اور معاشرتی نظام پر افسوس کرنے پر مجبور ہو جائے۔ خاص طور پر اس دور میں جب مغربی تہذیب سے بڑھتی قربت کے اثرات کے باعث انتشار اور بداعمالیاں سماج میں فروغ پا رہی تھیں۔ انجم مانپوری اپنے عہد میں یقینی طور پر شہرت اور مقبولیت کی بلندی پر تھے۔ انھوں نے جو راہ اپنائی تھی، وہ ان کی اپنی بنائی ہوئی راہ تھی۔ جن پر وہ کامیابی اور شان کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے ہم عصر طنز و مزاح نگار مثلاً شوکت تھانوی، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ وغیرہ جیسے روشن نام کے مقابلے مانپوری کے انشائیے اپنی واضح شناخت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اس کے باوجود افسوس اس بات کا ہے کہ ادبی منظر نامہ پر مانپوری کو نظر انداز کیا گیا۔ جس کا شکوہ 1940ء میں مانپوری کے دوسرے مجموعہ انشائیہ ''طنزیات'' کے مقدمہ میں علّامہ جمیل مظہری نے بڑے طنزیہ لیکن بڑے کرب کے ساتھ اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''اب رہا عوام میں ان کی قدردانی کا سوال، تو مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مانپوری ابھی تک اپنے ہم وطنوں کی چشم اعتبار میں اپنی جگہ نہیں بنا سکا۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ مانپوری اس کا مستحق نہ تھا بلکہ سچ پوچھئے تو اعتبار کی ان آنکھوں میں کمال کے لیے جگہ نہ تھی اور مانپوری کے پاس صرف کمال تھا۔ وہ غریب نہ فرانس کا والٹیر تھا، نہ انگلستان کا اڈیسن نہ لاہور کا پطرس، نہ لکھنو کا شوکت تھا، نہ علی گڈھ کا رشید احمد صدیقی، وہ صرف بہار کا مانپوری تھا۔ اس بہار کا جسے معاش کی دھن میں ارباب دولت اور ارباب اختیار کی پرستش سے فرصت نہیں...''۔

افسوس کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود جمیل مظہری کے شکوہ کا اب تک تدارک نہیں ہوا ہے۔ انجم مانپوری کے ساتھ کی جانے والی ناقدری کی جانب بہت سارے مشاہیر ادب نے وقتاً فوقتاً اشارہ کیا ہے۔ اردو طنز وظرافت کے میدان میں مانپوری کے بعد کی نسل میں چند ہی ممتاز طنز و مزاح نگار سامنے آئے مثلاً فکر تونسوی، کنھیا لال کپور، نریندر لوتھر، سلیمان خطیب، احمد جمال پاشا، یوسف ناظم، مشتاق احمد یوسفی، رضا نقوی واہی، مجتبیٰ حسین، ہاشم عظیم آبادی اور اسرار جامعی وغیرہ۔ ان کے بعد یہ میدان معدوم ہوتا ہوا اب تقریباً گم ہوتا نظر آ رہا ہے۔ مانپوری نے اپنے ساتھ ساتھ اور اپنے بعد اپنے آس پاس ایسے کئی طنز و مزاح نگاروں کو سامنے لانے میں کامیاب ہوئے، جو ان کی تقلید میں طنز وظرافت کے منظر نامے پر ابھرے ضرور، لیکن بہت دیر تک اپنی چمک دمک برقرار نہیں

رکھ پائے۔ ایسے طنز و مزاح نگاروں میں اس وقت بے اختیار جو چند نام ذہن کے پردے پر ابھرتے ہیں ،ان میں بے ڈھب گیاوی، کشتہ گیاوی ، شوہر گیاوی، شمس گیاوی، تماشہ گیاوی، ظرافت گیاوی، آفت گیاوی وغیرہ کے نام مقامی سطح پر اکثر یاد کئے جاتے ہیں۔ افسوس کہ عہد حاضر میں ایسے بہت کم نام ہیں، جو مانپوری کی طنز وظرافت کی شاندار اور جاندار روایت کو آگے بڑھانے کی حتی الامکان کوشش کر رہے ہیں۔

انجم مانپوری کی خدمات کو میں نے تین حصّوں میں منقسم کیا ہے، جن میں انجم مانپوری نے اپنی منفرد شناخت بنائی۔ اوّل میدان طنز وظرافت کا رہا، اس کے بعد شاعری میں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت اس حد تک برقرار رکھی کہ علاّمہ جمیل مظہری جیسے بلند پایہ شاعر کو ان کی شاعری کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا پڑا تھا کہ اپٹوڈیٹ شاعری میں انہوں نے خاص اپنی شاعری کے جو نمونے پیش کئے ہیں وہ ڈنکے کی چوٹ پر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مانپوری نے اگر نثر کے ساتھ نظم کو بھی اپنی شاعری کا آلہ بنایا ہوتا تو اکبرالہ آبادی مرحوم کی خلافت کا مسئلہ بغیر کسی نزاع کے ان کے ہاتھ پر طئے ہوجاتا ہے۔
انجم مانپوری کا تیسرا اور بہت اہم میدان ادبی صحافت کا رہا۔ اردو کی ادبی صحافت کے میدان میں انجم مانپوری کی بسائی وسیع دنیا کی ہم بات کریں، تو مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اب سے تقریباً سو سال قبل ادبی وصحافتی میدان میں جو مشکلات تھیں، وہ آج کے عہد میں نہیں ہیں، بلکہ اس دور کے مقابلے مسائل کم اور وسائل کہیں زیادہ دستیاب ہیں۔ اس کے باوجود افسوس کا مقام ہے کہ انجم مانپوری نے اپنی ادارت میں اپنے اردو ماہنامہ ''ندیم'' کی اشاعت کر کے اردو زبان وادب کے حسن و معیار میں جس طرح اضافہ کیا اور جس ضخامت اور معیار کے خاص بہار نمبر شائع کر کے جو مثال قائم کی ہے۔
ایسی شاندار اور تاریخی مثال اتنے برسوں بعد بھی دیکھنے کو نہیں ملی۔

اس لحاظ سے حکومت بہار کا اردو ڈائریکٹوریٹ نہ صرف شکریہ بلکہ مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس محکمہ نے ایک عرصہ سے ہمہ جہت فنکار انجم مانپوری کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور حق تلفی کے تدارک کے لئے زیر نظر فردنامہ کی اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ گرچہ صفحات کی تنگ دامانی کے باعث انجم مانپوری کے تعلق سے ایسی بہت ساری تفصیلات اس فردنامہ میں نہیں آسکیں، جنھیں آنا چاہئے تھا۔ لیکن اس مونوگراف کی اشاعت سے یہ ضرور ہوگا کہ نئی نسل یا بہار سے باہر جو لوگ انجم مانپوری کی عظمت سے واقف نہیں ہیں، وہ انجم مانپوری کو ان کی مختلف خصوصیات کے حوالے سے واقف ہونگے، نیز ان

کے کارناموں پر کوئی تحقیقی وتنقیدی کام کرنا چاہے تو وہ اس فردنامہ سے استفادہ کرتے ہوئے آگے بڑھ سکتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ انجم مانپوری کے تینوں مجموعہ مضامین (انشائیوں) کے علاوہ ایسے کئی انشائیے ہیں جو مختلف رسائل میں شائع تو ضرور ہوئے، لیکن وہ مانپوری کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکے۔ انھیں یکجا کر شائع کیا جائے۔ انجم مانپوری کے مشہور زمانہ رسالہ ''ندیم'' کے جو دو، تین خاص بہار نمبر شائع ہوئے، انھیں جدید تکنالوجی کے ساتھ شائع کیا جائے، جو بہار کے لیے بہت قیمتی ادبی اثاثہ ثابت ہوسکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ''ندیم'' کے مختلف شماروں میں شامل انجم مانپوری کے تاریخی اداریوں کو بھی ترتیب دے کر ایک کتابی شکل میں شائع کئے جانے کی ضرورت ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس فردنامہ کے ذریعہ انجم مانپوری کو نئے سرے سے جاننے، پہچاننے اور ان کی عظمت کے اعتراف کی مثبت کوشش ہوگی۔ ایسی کوششوں سے انجم مانپوری کو کتنا فائدہ ہوگا، یہ تو میں نہیں کہہ سکتا، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ایسی کوشش اور عمل سے اردو ادب وصحافت کو بڑا فائدہ ہوگا۔

میں ایک بار پھر حکومت بہار کے اردو ڈائرکٹوریٹ، پٹنہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے انجم مانپوری جیسے اہم لیکن نظر انداز کئے گئے بہار کے اس فنکار کی شخصیت اور فن کا جائزہ ایک فردنامہ میں پیش کرنے کی پیش قدمی کی ہے۔

(ڈاکٹر) سیّد احمد قادری

انجم مانپوری: ایک نظر میں

- اصل نام : نور محمد
- قلمی نام/تخلص : انجم مانپوری (طنز و مزاح میں مانپوری اور سنجیدہ کلام میں انجم)
- نام والد : شیخ باقر علی
- ولادت : 1881ء
- جائے ولادت : محلہ موریا گھاٹ، گیا (بہار)
- شادی : 1905ء کے آس پاس
- اولاد : 1906ء (کل دو لڑکے تین لڑکیاں)
- دستار بندی : 1906ء
- تصانیف :

1. طنزیات مانپوری (اوّل۔1938ء)
2. طنزیات مانپوری (دوم۔1940ء)
3. مطائبات مانپوری (1952ء)
4. مرنے کے بعد (1963ء)
5. نورتن (بزبان ہندی، 1952ء)
6. کلام انجم مانپوری (شعری مجموعہ، مرتب: معین شاہد۔1979ء)

- صحافت :
  - ۱۹۱۴ء میں گیا ضلع سے نیم مذہبی رسالہ 'رہنما' جاری کیا۔
  - ۱۹۳۱ء (جون) میں گیا ضلع سے مشہور زمانہ رسالہ 'ندیم' جاری کیا۔
  - ۱۹۳۳ء میں 'ندیم' کا مشہور و مقبول خاص شمارہ 'بہار نمبر' شائع کیا۔
- وفات : 27/اگست 1958ء
- مدفن : کربلا قبرستان، گیا (بہار)

✿

انجم مانپوری کی حیات

انجم مانپوری طنز و ظرافت کا ایک ایسا نام ہے۔جس نے اپنی فنکارانہ کاوشوں سے اس فن کو وسعت اور وقعت بخشنے میں اہم رول ادا کرتے ہوئے اس فن کو بام عروج پر پہنچایا تھا۔لیکن افسوس کہ عہد حاضر میں اردو زبان و ادب کی صنف طنز و ظرافت میں نہ وہ حسن و معیار رہا اور نہ ہی وہ چاشنی رہی، نہ دلفریبی رہی جو کبھی انجم مانپوری جیسے فنکاروں نے قائم کی تھی۔

انجم مانپوری نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں، وہ عہد یقینی طور پر طنز و ظرافت کے عروج کا عہد تھا۔اس دور میں بڑے بڑے طنز و مزاح نگار اپنی شاندار نگارشات کے ساتھ سامنے آئے اور لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ اس طرح بنائی کہ لوگوں کو ایسی طنز و ظرافت سے بھری نگارشات کا انتظار رہتا تھا۔

انجم مانپوری کا اصل نام نور محمد تھا۔لیکن انھوں نے اپنا قلمی نام انجم مانپوری اختیار کیا۔اکثر وہ اپنی سنجیدہ تحریروں کے لئے انجم اور طنز و مزاح کے لئے مانپوری کے ساتھ سامنے آتے تھے۔انجم مانپوری نے ریاست بہار کے مشہور تاریخی شہر گیا کے پھلگو ندی کے مشرقی کنارے پر آباد مانپور قصبہ میں اپنی آنکھیں کھولیں اور یہیں سن بلوغت تک رہے۔اس قصبہ سے متعلق تاریخ یہ ہے کہ اب سے دو تین صدی قبل انگریزوں کی جانب سے مقرر کئے گئے گورنر امبیر کے راجہ مان سنگھ نے اسے بسایا تھا۔جس کی وجہ کر یہ علاقہ ان کے نام سے منسوب ہوگیا، جیسا کہ اس زمانے میں عام طور پر ہوتا تھا۔اتفاق ایسا کہ جس پھلگو ندی کا میں نے ذکر کیا، اس ندی پر پُل بنانے کا ٹھیکہ بھی انجم مانپوری کے بڑے بھائی حاجی دلاور حسین کو ہی ملا تھا۔

انجم مانپوری کی حیات کا ایک عمومی جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ انجم مان پوری غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے اور کئی لحاظ سے تاریخ ساز شخصیت کے حامل تھے۔ان کے ابتدائی حالات کا مختصراً جائزہ کے بعد اس طرح کی تصویریں سامنے آتی ہیں:

انجم مانپوری کی ابتدائی تعلیم اس علاقہ کے جیّد عالم مولانا خیر الدین مرحوم اور مولانا عبدالغفار مرحوم کے زیر نگرانی ہوئی۔ان سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اردو، فارسی اور دینیات کی

تعلیم ملک کے کئی علماء سے حاصل کی۔تعلیم کی حصولیابی کی یہ پیاس ہی تھی کہ اس کے لئے وہ لکھنؤ، ندوۃ العلماؔ اور مرادآباد بھی گئے۔اسی دور میں ندوہ میں وہ اپنے زمانے کی مشہور و مقبول شخصیت مولانا سید سلیمان ندوی کے ہم درس ہوئے اور بچپن کی یہ دوستی ہمیشہ برقرار رہی۔گرچہ دونوں کا میدان عمل مختلف رہا،لیکن مقبولیت دونوں کے حصّے میں آئی۔انجم مانپوری نے ندوۃ العلماؔ کے بعد مزید تعلیم کے لئے مرادآباد کا سفر کیا اور شاہی مسجد مرادآباد میں،مولانا احمد حسن امروہوی اور مولانا محمود حسن سہسوانی کی شاگردی اختیار کی۔تعلیم کا یہ سلسلہ یہاں بھی نہیں رکا بلکہ اپنے وطن مانپور (گیا) لوٹنے کے بعد گیا کے مدرسہ کنزالعلوم میں بھی وہ زیر تعلیم رہے۔طالب علمی کے دور میں ہی ملک کے کئی اہم ادباء وشعراء سے ان کے روابط ہوئے اور عشرت لکھنوی سے اپنی شاعری میں وہ اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔

1905ء کے آس پاس ان کی شادی ہوئی اور 1906ء میں پہلی بچّی تولد ہوئی۔وہ دولڑکے اور تین لڑکیوں کے والد ہوئے۔لیکن دونوں لڑکے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔بیٹیوں میں ایک بیٹی کی بڑی دھوم دھام سے شادی کی تھی۔ایک داماد عالم شباب میں ہی فوت ہو گیا،دوسرا رعشہ کے مرض میں برسوں مبتلا رہنے کے بعد جوانی ہی میں داغ مفارقت دے گیا۔چھوٹی بیوہ بیٹی ہی اپنے والد کی خدمات میں مصروف رہا کرتی تھی۔1946ء میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔اپنی اہلیہ کو سامنے رکھ کر مانپوری نے کئی انشائیے لکھے،خاص طور پر''ایڈیشنل وائف''میں مغرب زدہ بیویوں کے مقابلے مشرقی بیگمات کی تعریف جس طرح بیان کی ہے،یقینی طور پر اس تعریف کے تصور میں ان کی اپنی بیگم ہی تھیں یا پھر ایک دوسرے انشائیہ''ماما کی مصیبت''میں جو اندرون خانہ کے اوصاف بیان کئے ہیں،یہاں بھی ان کی بیگم ہی ذہن میں رہی ہونگی۔

انجم مانپوری کے لئے 1906ء اہم سال رہا کہ اسی سال گیا میں ان کی دستار بندی بڑے تزک واحتشام کے ساتھ ہوئی۔اس بہت ہی اہم اور خصوصی تقریب میں علاّمہ شبلی نعمانی،علاّمہ عبدالحق حقانی، مولانا عبدالوہاب منطقی اور مولانا سید امیر حسن بلیاروی (شوق بلیاروی کے نام سے شاعری کرتے تھے اور وہ پروفیسر اختر قادری کے جدامجد تھے) جیسی اپنے دور کی اہم دینی شخصیات نے انجم مانپوری کے سر پر دستار فضیلت باندھ کر اس تقریب کو تاریخی بنایا تھا۔

انجم مانپوری نے باضابطہ کسی اسکول میں داخلہ لیا اور نہ ہی انگریزی کی تعلیم پر کوئی توجہ دی۔اس کے باوجود ان کی انگریزی زبان کی معلومات ایسی تھی کہ انھوں نے اپنی نثری وشعری تخلیقات میں انگریزی کا خوب

استعمال کیا ہے۔اپنی عربی اور انگریزی تعلیم کے سلسلے میں انجم مانپوری''مطائبات''میں بیان کرتے ہیں:

''....باقی رہی علمی حیثیت تو آپ اسی سے قابلیت وصلاحیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عربی زبان میں دنیا کی سب سے اہم اور مقدس کتاب''الفرقان''جس میں سارے جہاں کے علمی خزانے ہیں۔صرف دس سال کی عمر میں ختم کر دینا اور اسی کے ساتھ فارسی زبان میں حضرت سعدی کی مشہور اور مقبول''کریما''اس کمسنی کے زمانے میں پڑھ لینا کیا معمولی کارنامہ کہا جا سکتا ہے؟۔انگریزی زبان کا شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب اخبار ہو جسکی عبارت پڑھنے میں بلا لحاظ تلفظ رکاوٹ محسوس ہوتی ہو۔انگریزی کا گرامر پڑھے بغیر اور کسی اسکول میں داخل نہ ہونے کے باوجود یہ انگریزی خوانی کی خدادادصلاحیت نہیں تو اور کیا ہے۔''

(مطائبات مانپوری:صفحہ:7-8)

انجم مانپوری اپنے پیشہ اور مشاغل کے تعلق سے بھی اپنے مخصوص اور منفرد انداز اپناتے ہوئے بتاتے ہیں کہ:

''سابق پیشہ زمینداری وقدرے کاشتکاری موجودہ مشغلہ صرف ادائے مالگذاری،کچہری کی بستہ برداری،وکلاؔ اور عملوں کی ناز برداری اور گاہے گاہے مضمون نگاری۔''

(ایضاً۔صفحہ:7)

انجم مانپوری،چار بھائی تھے،جن کے نام حاجی دلاور حسین،وزیر محمد،عبدالکریم اور نور محمد (انجم مانپوری)۔انجم مانپوری اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔اس لئے ان کے تینوں بھائی انھیں بہت مانتے تھے۔ان کے والد کا خاندانی پیشہ تجارت تھا اور اپنے علاقہ کے وہ بڑے تاجروں میں شمار کئے جاتے تھے۔1906ء میں دستار بندی کے بعد یہ سمجھا گیا کہ انجم مانپوری کی تعلیم کا اب سلسلہ ختم ہوا اور اب انھیں برسرروزگار ہونا چاہئے۔چنانچہ ان کے والد نے 1907ء میں ان کے لئے شہر میں ایک ٹیلرنگ شاپ کھول دی۔جس کا نام مانپوری نے اپنے بے حد قریبی دوست رفیق اور اپنے نام کو جوڑ کر''رفیق انجم کمپنی''رکھا۔ان کے دیرینہ دوست رفیق بعد میں گیا کی مشہور اور تاریخی جامع مسجد کے پیش امام مقرر ہوئے۔انجم مانپوری کے مزاج کے برخلاف ٹیلرنگ شاپ کھولنے کو تو کھول لیا گیا،لیکن ان کی عدم دلچسپی کے باعث زیادہ کامیاب نہیں رہا اور اسے بند کر دیا گیا۔کچھ دن تک وہ اپنے والد کی تجارت سے منسلک رہے،لیکن یہاں بھی ان کی عدم دلچسپی دیکھتے ہوئے ان کے بھائیوں نے انھیں سخت وسست کہا۔

جس کا انھیں برا لگا اور وہ خاموشی سے زمانے کی روش کے مطابق تلاش معاش کے لئے ماہ رمضان میں ہی کلکتہ روانہ ہو گئے ۔ یہاں وہ سخت آزمائشوں اور مشکل حالات سے گزرے۔غریب الوطنی میں روزہ رکھا اور پھر عید بھی ایسے ہی مشکل حالات میں پردیس میں سامنے آئی۔اپنے لوگوں کی یادوں سے دل بھر گیا ،اپنوں کی محبت اور شفقت نے انھیں رلایا بھی۔اسی دور کی یاد دلاتی ان کی نظم ''مسافر کی عید'' ہے۔جس میں ان کے درد و کرب کا پرتو بہت نمایاں ہے۔کلکتہ میں تلاش معاش میں کامیابی نہیں ملنے کے سبب اور اپنے وطن کی یاد کی شدّت نے انھیں اپنے وطن واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا اور واپس لوٹ کر اپنے بھائیوں کے ساتھ تجارت میں خود کو شامل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔اس دوران ان کے ادبی مشاغل کا سلسلہ جاری رہا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تجارت کی بجائے ان کی دلچسپی ادب وصحافت میں زیادہ رہی۔جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے گیا جیسی چھوٹی جگہ سے جہاں اس وقت اخبار ورسائل کی کتابت وطباعت کی سہولیات میّسر نہیں تھیں ، اس کے باوجود انھوں نے 1914 ء میں ایک نیم مذہبی رسالہ ''رہنما'' نکالا۔لیکن اس میدان کی ناتجربہ کاری اور مالی دشواریوں کے سبب جلد ہی بند ہو گیا۔یہ رسالہ بند ہونے کو تو بند ہو گیا،لیکن انجم مانپوری کے دل ودماغ میں صحافتی دلچسپی کو بڑھا دیا۔ان کا یہ پہلا تجربہ بعد میں بہت کام آیا۔

ان چند برسوں میں تجارت سے عدم دلچسپی اور نثری وشعری تخلیقات سے بڑھتے رجحان سے انجم مانپوری کی نفسیات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ وہی دور تھا جب آسمان ادب وصحافت پر لاہور چمک رہا تھا۔لاہور کے سلسلے میں اس زمانے میں مشہور تھا کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ یہاں کی ادبی،سماجی، ثقافتی وصحافتی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔اس ادبی وصحافتی چمک دمک سے انجم مانپوری بھی متاثر تھے۔

1918 ء کا ہی وہ ایک اہم دن تھا جب انجم مانپوری ایک بار پھر اپنا گھر دوار اور جمی جمائی تجارت کو چھوڑ کر لاہور کے لئے چل دئے۔ جہاں ان کی ملاقات مولانا ظفر علی خاں جیسی اہم ادبی وصحافتی شخصیت سے ہوئی۔اس زمانے میں ان کے اخبار ''زمیندار'' کی اور ان کی طنز وظرافت نگاری کی بڑی دھوم تھی۔ظفر علی خاں نے از راہ عنایت انجم کو اپنے اخبار کا سب ایڈیٹر بنا دیا۔اس اخبار کی سب ایڈیٹری اور ظفر علی خاں کی قربت اور پھر لاہور کی ادبی وصحافتی فضا نے انجم کے ذوق وشوق کو نہ صرف جلا بخشی بلکہ بہت سارے صحافتی تجربات اور طنز ومزاح کے فنّی نکات کو سمجھنے میں مدد ملی۔لاہور کا سفر اور ظفر علی خاں کی قربت نے انجم مانپوری کو مہمیز کیا اور ان کے دل ودماغ میں طنز وظرافت اور ادبی صحافت کے میدان میں شہرت و مقبولیت حاصل کرنے کی تمنا جاگ اٹھی۔اس ذوق وشوق کو لئے وہ اپنے وطن گیا لوٹے اور یہاں آکر

انہوں نے اپنے والد اور بھائیوں کی رہنمائی میں اپنا ذاتی کاروبار ''انجم کمپنی'' کے نام سے شروع کیا اور اپنی محنت ولگن سے اس ''انجم کمپنی'' کو کافی فروغ دیا۔اسی زمانے میں اس کمپنی کو لوہے کا اسٹاکسٹ بھی بنایا گیا تھا نیز دوسری جنگ عظیم پر سی پی ڈبلیوڈی کے بہت سارے کاموں کا ٹھیکہ بھی انھیں ملا۔جس سے ان کی کمپنی کو کافی ترقی حاصل ہوئی۔اسی درمیان 1921ء میں ان کے والد شیخ باقر علی کا انتقال ہو گیا۔ان کے انتقال سے جہاں ان کی زندگی میں ایک خلاء پیدا ہو گیا، وہیں خاندان کی جائداد کو چاروں بھائیوں کے درمیان بٹوارہ کے باعث ان کی محرومی کے احساس کے ساتھ ساتھ ان کی تجارتی ذمّہ داریوں میں اضافہ ہوا۔انھیں اپنی تجارت کی جانب زیادہ محنت ولگن کا مظاہرہ کرنا پڑا،جس سے ان کی تجارت میں مذید کامیابی حاصل ہوئی۔انجم مانپوری کی گیا کے موریا گھاٹ محلّہ کے پھلگو ندی کے کنارے والے اپنے بنگلہ میں رہائش تھی۔اپنے رسالہ ''ندیم'' کے سرورق پر اکثر وہ اپنے اسی بنگلہ کی تصویر شائع کیا کرتے تھے۔جس کی پیشانی پر ایک قطعہ اس طرح درج ہوا کرتا تھا ۔

عشرت کدہ نہ قصر معلّیٰ بنائیے — چھوٹی سی اک سکون کی دنیا بنائیے
تنہائی ہو تو مونس تنہائی ہو ندیم — اک کنج عافیت لب دریا بنائیے

انجم مانپوری اپنے اسی بنگلہ میں اپنے دوست واحباب کے ساتھ شطرنج اور شعر وادب کی محفل سجایا کرتے تھے۔جن کا ذکر بڑے ہی جذباتی انداز میں اپنی آخری نظم میں کیا ہے۔اسی رہائش گاہ میں وہ تا عمر رہے اور یہیں انھوں نے زندگی کی آخری سانس لی۔

معاشی طور پر جب انجم مانپوری کامیاب ہو گئے تو ایک بار پھر نہ صرف اردو ادب وصحافت کی جانب بلکہ سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی متحرک اور فعال ہو گئے۔اپنے آبائی علاقہ مانپور سے کئی بار میونسپل کمشنر منتخب ہوئے اور میونسپل کمشنر رہتے ہوئے ان کے جو کچھ تلخ وشیریں تجربات رہے۔انھیں بڑے ہی خوبصورت اور طنز وظرافت کے پیرائے میں اپنے کئی انشائیوں میں انھوں نے پیش کیا ہے۔گیا ڈسٹرکٹ بورڈ کے بھی اس زمانے میں ممبر منتخب ہوئے تھے۔جس زمانے میں ضلع گیا کے ایک سب ڈویژن اورنگ آباد سے تعلق رکھنے والے اور اپنے دور کے بڑے سیاسی رہنما اور وزیر مالیات انوگرہ نرائن سنگھ چیئر مین تھے ۔اس دور میں ان کی قومی شاعری کی کافی دھوم تھی۔1922ء میں گیا شہر کے گیا ٹاؤن ہال میں کانگریس کمیٹی کی جانب سے منعقد ہونے والے ایک عظیم الشان جلسہ کی روداد بیان کرتے ہوئے اپنے دور کے مشہور شاعر اور سیاست داں جگیشر پرساد خلش نے اپنی ایک کتاب ''نگارش'' میں لکھا ہے کہ اس تاریخی

جلسہ میں انجم مانپوری نے اپنی ایک ولولہ انگیز قومی نظم اس طرح پیش کی کہ پورا مجمع واہ واہ اور انقلاب زندہ باد کے نعروں سے پورا ہال گونجنے لگا۔ جگیشر پرساد خلش کے مطابق ان کی اس نظم سے صدر جلسہ شری کرشن پرکاش سین بھی اتنے متاثر ہوئے کہ خوشی میں کھڑے ہوگئے اور انھیں گلے لگالیا۔ اس دور میں انجم مانپوری کے تعلقات کئی اہم اور بڑے سیاست دانوں، رؤسا اور شاعر و ادیب و دانشوروں سے تھے۔ ان میں سید ظفر نواب، خواجہ محمد نور (سابق چیف جسٹس پٹنہ ہائی کورٹ اور وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی)، سید حسن امام، لالہ برہمد سہائے، رائے بہادر کیدار ناتھ، لکشمی نرائن وکیل، خان بہادر فرزند احمد سلطان، مہاراجہ ٹکاری گوپال سرن، عاشق وکیل وارثی، سر سلطان احمد، سر عبدالعزیز، ڈاکٹر سید محمود (سابق وزیر، وزارت خارجہ)، جیسی اپنے دور کی نامور ہستیوں کے نام شامل ہیں۔ اس زمانے میں ان کے ہم عصروں میں کئی مشاہیر ادب کے ایسے نام تھے، جن کے نام کے چراغ روشن تھے۔ ان میں علاّمہ فضل حق آزاد، عرش گیاوی، عشرت گیاوی، کشتہ گیاوی رسا ہمدانی، عشرت بیتھوی، شفق عماد پوری وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے ہم عصروں کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ یہ وہ دور تھا جسے طنز وظرافت کا سنہری دور کہا جاسکتا ہے اور لکھنؤ کے رسالہ ''اودھ پنچ''، اور پٹنہ کے ''پنچ'' کی دھوم عام وخاص کے درمیان اس حد تک تھی کہ ہر کوئی طنز ظرافت کے میدان میں اپنی کامیابی کا پرچم لہرانا چاہتا تھا۔ اس زمانے میں انجم مانپوری کی قربت طنز و مزاح اور سنجیدہ شاعری کے میدان کے شعراء میں سریر کابری، بسمل سنسہاروی، جگیشر پرشاد خلش، کشتہ گیاوی، شمس گیاوی، مقصود گیاوی، بیڈھب گیاوی وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں۔ اسی دور میں انجم مانپوری نے اپنی ہمّت اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جون 1931ء سے ایک بے حد معیاری ادبی ماہنامہ ''ندیم'' کا اجراء کیا۔ اس وقت ان کی مشکل پسندی کی تعریف کرنا ہوگی کہ اس زمانے میں جب کہ گیا میں کتابت وطباعت کی سہولیات میسر نہیں تھیں، پھر بھی ہمت و حوصلہ سے کام لیتے ہوئے اور تمام تر مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے انھوں نے ''ندیم'' جیسا اہم اردو کا رسالہ نکالنے کی ہمت دکھائی اور یہ ان کا جنون ہی تھا کہ وہ مسلسل 1937ء تک ''ندیم'' نکالتے رہے اور اپنی فکری، فنی، ادبی اور صحافتی صلاحیتوں سے اس رسالہ کو صف اوّل کا رسالہ بنایا۔ ''ندیم'' کے تین 1932،1933،1935 یادگار اور تاریخی ''بہار نمبر'' شائع کر بہار کی اردو صحافت کی تاریخ میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ اس کی تفصیل انجم مانپوری کی صحافت کے باب میں بیان کیا گیا ہے۔

انجم مانپوری کے رسالہ ''ندیم'' کی شہرت دور دور تک پھیلی، جس کے باعث انجم مانپوری کا

حلقۂ احباب بھی کافی بڑھ گیا تھا۔ اس تعلق سے انجم مانپوری کے نواسہ ابو منظر، انجم مانپوری کے آخری مجموعہ انشائیہ ''مرنے کے بعد'' میں لکھتے ہیں:

''ندیم کے سلسلے میں ملک کے بے شمار مشہور ادیب و شاعر سے آپ کے روابط قائم ہوگئے تھے۔ انجم میں ایک بڑا وصف یہ بھی تھا کہ ہر زمانہ میں انھیں شاعروں، ادیبوں، لیڈروں اور دوستوں کی خاطر و مدارات اور میزبانی کا شرف رہا۔ مثال کے طور پر نواب نصیر حسین خیال مرحوم، منشی سکھدیو پرشاد بسمل، بیدم وارثی، علاّمہ سید ریاست علی ندوی، علاّمہ آزاد سبحانی، علاّمہ ظفر علی خاں، ڈاکٹر سید محمود، علاّمہ جمیل مظہری، سید وصی احمد بلگرامی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، روش صدیقی جیسی معروف شخصیتیں آپ کے احباب خاص میں تھیں۔ مشہور مزاح نگار مصنف عظیم بیگ چغتائی سے انجم صاحب کی پہلی ملاقات بڑے دلچسپ طریقے میں ہوئی تھی۔ ایک روز انجم سے ملنے ان کے گھر تشریف لائے اور یہ انجم کو نہ پہچانتے تھے۔ انجم لب دریا اپنے بنگلہ میں ایک پلنگ پر دراز تھے۔ عظیم بیگ نے انجم سے مخاطب ہوکر پوچھا ''انجم صاحب تشریف رکھتے ہیں؟ انھوں نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ''جی نہیں'' چغتائی نامراد لوٹے اور باہر آکر تصدیق کے لئے دوبارہ نوکر سے دریافت کیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ منکر انجم ہی ہیں تو آتے ہی بے اختیار انجم سے لپٹ گئے۔ شہر گیا میں انجم مانپوری کے مخصوص احباب سید ظفر نواب مرحوم اور خواجہ محمد نور مرحوم (سابق چیف جسٹس، پٹنہ ہائی کورٹ اور وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی) تھے۔ ان سے انجم کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ ان کے علاوہ آپ کے مراسم ڈاکٹر انوگرہ نرائن سنہا، سابق وزیر مالیات بہار اور سید عبدالعزیز مرحوم سابق وزیر مذہبی و دینیات حیدرآباد دکن سے بھی تھے۔''

('مرنے کے بعد' مرتب: ابومنظر، صفحہ: ۱۱)

انجم مانپوری کے حلقۂ احباب میں کیسی کیسی جید شخصیتیں شامل تھیں۔ اس کا اندازہ ان چند خطوط سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جنھیں ابو منظر نے ''مرنے کے بعد'' میں نقل کیا ہے۔ افسوس انجم مانپوری کے نام آنے والے خطوط کا قیمتی اثاثہ ضائع ہوگیا، ورنہ ان خطوط سے ایک شاندار ادبی تاریخ مرتب ہو سکتی تھی۔ پھر بھی ابو منظر لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے درج ذیل چند خطوط اپنی مرتب کردہ کتاب ''مرنے کے بعد'' میں شامل کیا ہے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے انجم مانپوری کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ پہلا خط مسٹر سر عبدالعزیز کا ہے۔ جو اپنے دور کی جید ہستیوں میں شمار کئے جاتے تھے اور

آج بھی ان کی خدمات کا لوگ اعتراف کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

حیدرآباد دکن ۱۷رفروری ۱۹۴۲ء

جناب مولوی انجم صاحب: تسلیم

آپ کا خط پہلے ملا اور دونوں کے بعد طنزیات کی دوسری جلد پہنچی۔ پہلی جلد کا مطالعہ نہ کر سکا چوں کہ الہ آباد میں ڈاکٹر متھرا داس مل گئے اور میں نے اس کتاب کی تعریف کی تو انھوں نے پڑھنے کو لے لیا۔ مگر میں نے جو کچھ پڑھا کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے مزاحیہ مضامین کا یہ مجموعہ خوب ہے۔ معمولی اور روزمرہ کی باتوں میں اپنی طرز نگارش سے آپ نے وہ لذت پیدا کی ہے کہ بعض ٹکڑوں کو پڑھ کر بہت سنجیدہ اور متین قسم کا آدمی بھی ہنسی ضبط نہیں کرسکتا۔ صحیح معاشرتی اخلاقی اور سیاسی شعور پیدا کرنے کا یہ بہت ہی بہتر اور لطیف پیرایہ ہے۔ جس کو بلاشبہ آپ نے بہت خوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کوشش کو مشکور فرمائے۔

(مسٹر سید عبدالعزیز) بارایٹ لا، پٹنہ

(سابق وزیر حیدرآباد دکن)

اردو ادب کی ایک اور باوقار شخصیت (ادیب الملک نواب) نصیر حسین خیال سے انجم مانپوری سے کس قدر بے تکلفی تھی اس کا اندازہ ان کے درج ذیل خط بنام مانپوری سے لگائیے:

کلکتہ عزیز المکرّم

انتظار تھا اور سخت۔ شکر ہے کہ آج نامہ ملا۔ شکریہ۔ وہ مضمون یوں لکھا گیا ہے جس طرح بے تکلفانہ خط لکھتے ہیں۔ پھر بھی یہ تہیہ کر لیا گیا تھا کہ ہمارا قلم نہ معلوم ہو۔ اس کے علاوہ بعض ایسی باتیں بھی اس میں ہیں جن کا کسی دوسرے کے قلم سے دہرایا جانا موزوں ہوگا۔ اس لئے آپ اصرار نہ کریں ارژنگ یا کسی اور نام سے اسے چھاپ دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بعد ہی ندیم کے لئے ایک ایسا مضمون بھیج دوں گا، جو ہمارے نام سے شائع ہو سکے گا۔ اس ''رشوت'' کے بعد خوش ہوکر ہمارے حق میں نیک فیصلہ کیجئے۔

بہار میں لکھنے والے تھے، ہیں اور پیدا ہوں گے۔ ندیم بیج بو چکا ہے۔ درخت اگیں

گے اور پھل لائیں گے مگر وہ خال خال ہوں گے۔ صوبہ کی عام زبان ہندی (بہاری) سے اردو اسی وقت ہوسکتی ہے۔ جبکہ بہاری اپنا روزمرہ بھی درست کریں۔ پھر اس زبان کے لئے بھی اور زبانوں کی طرح لہجہ کو بہت دخل ہے۔ پنجاب اپنے غرور میں گرا اور بہار غفلت کا شکار رہا۔ یہ عیب دور نہ ہوا اور زبان آ جائے۔ محال ہے۔ شاہنامہ پر تبصرہ جب تک کتابی صورت میں نہ چھپے اس کا فائدہ عام نہ ہوگا۔ ایسی چیز کسی زبان میں نہ ملے گی۔ آپ اسے شائع کریں تو میں اسے درست کر دوں۔ خرچ زیادہ نہ ہوگا۔ اور جو ہوگا نکل آئے گا۔ جواب دیجئے۔

بھائی انجم ہوں یا بھیا مانپوری دونوں قلم کے چور ہیں۔ مضمون لکھنے میں حاتم اور خط لکھنے میں قارون اور میں چاہتا ہوں کہ یہ بھلے آدمی خط بھی لکھا کریں۔ جواب میں زبان کے اور پھر ادبی نکتے خواہ مخواہ زبان قلم پر آ جائیں گے۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہوں گے کہ ندیم کے منہ میں پڑ کر وہ عام ہو جائیں۔ کیا اس کی طرف توجہ کی جا سکتی ہے؟

ہاں، گیا والوں پر آتش دوزخ حرام ہے۔ مگر کلکتہ والوں پر وہ کب حلال ہے۔ آج کل یہاں تشریف لائیے تو معلوم ہو جائے۔ اتنا ہے کہ پسینہ میں یوں ڈوبتے ہیں کہ جہنم کی ایندھن بنے بھی تو اس کے سکھانے میں میاں مالک کے ہاتھ خشک ہو جائیں گے۔ جھڑی تو خیر، دونگڑے تک کو ترستے ہیں اور بی پھلگو اپنا پیٹ ہی اونچا نہیں کرتیں کہ ذرا ہنسی آئے دل ٹھنڈا ہوا اور ان کے پاس بیٹھ کر پکوان تلے جائیں، ان پر چڑھائے جائیں اور پھرو۔ ح۔ ج۔ ذرا چھیڑے جائیں۔ دن گن رہا ہوں۔ اس لئے ان تینوں کو دور ہی سے سلام؛ والسلام

(ادیب الملک نواب) نصیر حسین خیال

اس وقت تک انجم مانپوری کی شناخت طول و عرض میں قائم ہو چکی تھی۔ گیا اور آس پاس کے علاقے کے عام لوگ جہاں انھیں انجم کمپنی کے مالک کے طور پر جان رہے تھے، وہیں ادبی دنیا میں لوگ انجم مانپوری سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ ایسے میں انجم مانپوری کی شکل و شباہت، ان کا انداز تخاطب وغیرہ جاننے کا لوگوں میں ایک تجسّس تھا۔ پھر بھی انھیں دیکھنے والوں نے ان کا جو حلیہ بیان کیا ہے۔ وہ اس طرح ہے۔ قد درمیانہ، رنگ سانولا، چہرہ کے ٹھوڑھی پر تھوڑی سی داڑھی، ہلکی سی مونچھیں، سر پر گول سی ٹوپی، لباس میں ہمیشہ کرتا، پائجامہ اور شیروانی۔ ویسے انھوں نے اپنے خدوخال کو یوں بیان کیا ہے۔ ''افسردہ صورت، شگفتہ طبیعت چہرے سے نمایاں متانت، گفتگو میں سنجیدہ ظرافت''۔ اس دور میں تصویر کا چلن اتنا عام نہیں

تھا۔ اس لئے لوگوں کی انجم مانپوری کو جاننے کی خواہش کے احترام میں اپنے ایک مضمون میں ان کے رشتہ دار اور اپنے دور کے معروف ادیب وصحافی قیوم خضر نے ان کا مختصر خاکہ پیش کرتے ہوئے مرزا عظیم بیگ چغتائی جیسی نامور شخصیت سے ان کے ملنے کے پُر لطف واقعہ کو بھی بیان کیا ہے۔اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔قیوم خضر لکھتے ہیں:

''پہلی بار ان سے ملنے والا تو ان کے جھانسے میں آ ہی جاتا۔چنانچہ مرزا عظیم بیگ چغتائی جب ان سے ملنے کو پہلی بار آئے تو اس وقت مانپوری معمولی سوتی کپڑے کی شیروانی، موٹے کپڑے کا کرتا پائجامہ اور سر پر دوپلّی ٹوپی اوڑھے کہیں جانے کی تیاری میں بیٹھے ہوئے تھے۔چغتائی صاحب نے مانپوری ہی سے آکر پوچھا ''انجم مانپوری صاحب تشریف رکھتے ہیں؟'' مانپوری نے جواباً برجستہ کہا ''جی نہیں''۔چغتائی صاحب نے ان کی کھچڑی داڑھی، مسکین نما صورت اور وضع قطع سے سمجھا کہ یہ کسی مدرسہ کا چپڑ قناطی مولوی یا کسی یتیم خانے کا چپراسی ہے۔جو چندہ لینے کی غرض سے آیا ہوا ہے۔یہ سوچ کر چغتائی صاحب واپس ہوگئے اور واپسی پر دربان سے پوچھا کہ ''مانپوری صاحب باہر سے کب تک لوٹیں گے؟'' اس نے کہا ''مالک تو اندر بنگلے پر کہیں جانے کی تیاری میں بیٹھے ہیں۔'' یہ سن کر چغتائی صاحب واپس آئے اور آتے ہی مانپوری سے لپٹتے ہوئے کہا کہ میرا نام عظیم بیگ چغتائی ہے، پرسوں آیا ہوں اور سر خواجہ محمد نور صاحب کی کوٹھی پر ٹھہرا ہوا ہوں'' مانپوری نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ''رسالوں میں چھپی ہوئی آپ کی تصویر دیکھی تھی جس سے اندازہ ہوگیا کہ آپ وہی ہیں جو آپ کہہ رہے ہیں'' اس کے بعد تو قہقہوں کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں اور خاطر مدارت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

(انجم مانپوری۔فنکار سے فن تک۔مرتبہ: سید احمد قادری صفحہ: 73)

اس مختصر تعارف سے انجم مانپوری کی شکل وشباہت، خاندانی پس منظر اور ابتدائی تعلیم وغیرہ کسی حد تک واضح ہوجاتی ہے۔ان کی شخصیت کے تعلق سے تفصیلات موجود نہیں ہیں۔مندرجہ بالا سطور میں، میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے بہت قریبی رشتہ داروں کے لکھے گئے تاثرات سے اخذ کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور فن پر لکھنے سے لوگوں نے نہ جانے کیوں گریز کیا ہے۔جس کا شکوہ بہت سارے لوگوں کو ہے۔ان کی حیات کے تعلق سے اس سے زیادہ کہیں کوئی تفصیل موجود نہیں ہے۔

انجم مانپوری کی خدمات

انجم مانپوری کی خدمات کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ پہلے ان کی تصنیفات پر ایک نظر ڈال لی جائے، تاکہ ان کتابوں میں شامل ان کے انشائیوں کے حوالے سے گفتگو میں آسانی ہو۔یوں دیکھا جائے تو مانپوری نے اپنے طور پر اپنے انشائیوں کی صرف تین کتابیں شائع کرائی تھیں۔''طنزیات مانپوری'' اوّل اور دوئم کے بعد ''مطائبات''۔ایک مختصر سی کتاب ان کے انتقال کے بعد انجم مانپوری کے نواسہ ابو منظر نے ''مرنے کے بعد'' کے نام سے 1963ء میں شائع کیا تھا۔

پہلی کتاب ''طنزیات مانپوری'' حصّہ اوّل 1938ء میں منظر عام آئی تھی۔جس کا مقدمہ وصی احمد بلگرامی کا تحریر کردہ ہے۔اس پہلی کتاب میں شامل انشائیوں کی تعداد: 13 ہے، جوکہ کتابی سائز میں 313 صفحات پر مشتمل ہے۔جس میں درج ذیل انشائیوں کو شامل کیا گیا ہے۔

(1) میر کلّو کی گواہی (2) ماما کی مصیبت (3) میری اسیری (4) ہاں میں ہاں (5) میرا روزہ (6) سکنڈ ہینڈ موٹر (7) پاگل خانے کی سیر (8) شادی کی تقریب (9) پنک آشرم (10) اڈیشنل وائف (11) میونسپل الیکشن (12) ہاتھی (13) کرایہ کی ٹم ٹم کے عنوانات سے انشائیے ہیں۔

انجم مانپوری کی اسی تصنیف یعنی ''طنزیات مانپوری'' حصہ اوّل کو 1990ء میں ٹی جے پبلی کیشنز ،اورنگی ٹاؤن، کراچی، پاکستان کے پبلشر محمد سراج نے شائع کرایا تھا۔جوکہ 380 صفحات پر مشتمل ہے۔جس کے سول ایجنٹ: کتاب منزل، سمن آباد، فیڈرل بی ایریا، کراچی کو مقرر کیا گیا تھا۔اس کتابی سائز کے 380 صفحات پر مشتمل کتاب کے سرورق کے اُوپر تحریر درج ہے ''برصغیر ہندوپاک کے معروف وممتاز طنز و مزاح نگار انجم مانپوری'' اس کے نیچے جلی حروف میں ''طنزیات مانپوری'' نمایاں طور پر درج ہے۔اس کے نیچے پروفیسر اظہر قادری کا چار لائن کے تاثرات اس طرح ہیں ''انجم مانپوری اردو طنز ومزاح کی تاریخ میں ایک روشن باب ہیں۔ان کے ذکر کے بغیر طنز ومزاح کی کوئی تاریخ مکمل نہیں کہلاسکتی۔'' اس سرورق پر انجم مانپوری کی تصویر کا چھوٹا سا اسکیچ ہے، ساتھ میں چار اشخاص کے بھی اسکیچ ہیں۔اس کتاب کی قیمت 35/

روپئے ہے۔ کتاب کے اندر دوسرے صفحہ پر بہت مختصر سا ایک صفحہ کا پیش لفظ مشتاق شبنم کا تحریر کردہ ہے۔ جو کہ کتاب کے پبلشر محمد سراج کے لکھے خط کے جواب کی شکل میں اس طرح لکھا گیا ہے:

بھائی سراج   سلام مسنون

آپ کا خط ملا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ''طنزیات مانپوری'' کی کراچی سے اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ انجم مانپوری ایک بڑے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے انسان اور ایک ذی علم شخصیت بھی تھے، لیکن افسوس ہے کہ اسکا اندازہ لوگوں کو کما حقہٗ نہیں ہے۔ اس کی وجہ انجم صاحب کی نام و نمود سے نفرت اور گوشہ میں بسر ہے۔ مذکورہ طنزیات کی اشاعت سے پاکستان میں ان کے رشحاتِ قلم کی اہمیت وافادیت کا دوبارہ اعتراف کیا جائے گا اور بہار کے اس عظیم ادیب کی قدر و منزلت کا احساس پیدا ہوگا۔ خدا آپ کو اپنے اس نیک مقصد میں کامیاب کرے۔ ہماری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔   والسلام   مشتاق شبنم   ٨/١١/٩٠

مشتاق شبنم کی اس مختصر تحریر کے بعد دوسرے پورے صفحہ پر انجم مانپوری کی وہی تصویر ہے، جو ہر جگہ موجود ہے۔ اس کے بعد کے صفحات پر مقدمہ طنزیات مانپوری کے عنوان سے صفحہ 1 سے 59 تک سید وصی احمد بلگرامی، ڈپٹی کلکٹر، پلاموں کا فرہنگ مانپوری کے ساتھ ذرا مختلف انداز کا مقدمہ ہے۔ سرورق کے آخری اندرونی صفحہ پر انجم مانپوری کی تصویر شائع کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں وصی احمد بلگرامی نے کئی عنوانات مثلاً گلستاں مانپوری، فرہنگ مانپوری، اور چھپن چھُری۔ کچھ لوگوں کو نہ جانے کیسے یہ غلط فہمی ہوگئی کہ یہ عنوانات مانپوری کی کتابوں کے نام ہیں اور اسی غلط فہمی کی بنیاد پر ان لوگوں نے ان عنوانات کو مانپوری کی فہرست کتب میں شامل کر دیا ہے، جو کہ سراسر غلط ہے۔

مانپوری کے انشائیوں کا دوسرا مجموعہ ''طنزیات'' حصّہ دوئم ہے۔ جو کہ 1940ء میں منظر عام پر آیا تھا اور اس کا مقدمہ مشہور شاعر علاّمہ جمیل مظہری نے بڑی محبت سے لکھا تھا۔

اس مجموعہ میں شامل انشائیوں کی تعداد: 12 جو 340 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں درج ذیل عنوانات کے تحت انشائیے موجود ہیں۔

(1) اپٹوڈیٹ شاعری (2) آنریری مجسٹریٹ (3) میری عید (4) تا مرد سخن نگفتہ باشد (5) ہوم پالیٹکس (6) وبال جان (7) اینٹی فادر کانفرنس (8) سخن تکیہ (9) ایک ناگہانی دوست (10)

اسٹوڈنٹ لائف (11) ہوسٹل لائف (12) صاحب کا کتّا۔

مانپوری کے تیسرے انشائیہ کے مجموعے کا نام ''مطائبات'' ہے جو کہ 1952 میں شائع ہوا تھا اور اس کا مقدمہ خود انجم مانپوری نے اتنے دلچسپ انداز میں لکھا ہے کہ یہ مقدمہ بھی ایک شاندار انشائیے میں ڈھل گیا ہے۔ 1952ء میں ہی مانپوری نے اپنے انشائیوں کے پہلے مجموعہ ''طنزیات'' حصّہ اوّل کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع کرایا تھا۔ اسی سال پہلے مجموعہ انشائیہ کے دوسرے ایڈیشن کا ہندی ایڈیشن ''نورتن'' کے نام سے بھی شائع ہوا تھا۔

انجم مانپوری نے اپنی تیسری تصنیف ''مطائبات'' کو اپنے دوست اور بہار کی معروف و معزز شخصیت ڈاکٹر سید محمود کے نام معنون کیا ہے۔ اس مجموعہ کو شاد بک ڈپو، مہندرو، پٹنہ۔٦ نے شائع کیا تھا۔ انجم مانپوری کے اس تیسرے مجموعہ مضامین (انشائیے) میں 9 عدد انشائیے شامل کئے گئے ہیں، جو مندرجہ ذیل عنوانات سے ہیں۔

(1) کلکتہ ریٹرنڈ (2) میری لیڈری (3) میری پہلی اسپیچ (4) دوستی (5) میرا سفر (6) انڈر گریجویٹ (7) ٹیوشن (8) سفارش (9) ہمارے داروغہ جی۔

انجم مانپوری کا چوتھا اور آخری مجموعہ مضامین (انشائیے) ''مرنے کے بعد'' 1963ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ جن میں کل پانچ انشائیے شامل ہیں۔ یہ مجموعہ انجم مانپوری کی تاکید کے بموجب ان کے انتقال (27 اگست 1958ء) کے پانچ برس بعد ان کے نواسے ابو منظر نے شائع کیا اور اس کا پیش لفظ ''ذکر انجم'' کے زیرِ عنوان خود انھوں نے ہی لکھا تھا۔ جس میں ایسی بہت ساری تفصیل بیان کی گئی ہیں، جو کہیں دوسری جگہ دیکھنے کو نہیں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انجم مانپوری کی شخصیت کے حوالے سے ابو منظر کی ان ہی تحریر سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں انجم مانپوری کے کُل پانچ انشایوں کو شامل کیا گیا ہے۔ جو سلسلہ وار ان عنوانات کے ساتھ ہیں۔

(1) مرنے کے بعد (2) انٹرویو (3) ناخواندہ مہمان (4) جھوٹ کا نباہ (5) اسٹیشن کی سیر۔

یہ ایک مختصر سا جائزہ انجم مانپوری کی تصانیف کا ہے، جن سے لوگوں کی واقفیت اس لئے کم ہے کہ ان کتابوں کی دوبارہ اشاعت کی کوشش نہیں کی گئی، جس کی وجہ سے اب یہ کتابیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

انجم مانپوری بحیثیت طنز وظرافت نگار

انجم مانپوری کی جن چار کتابوں کا ذکر میں نے مندرجہ بالا سطور میں نے کیا ہے۔ وہ انجم مانپوری کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین یا انشائیوں کے مجموعے ہیں۔ جن میں شامل انشائیوں کی کُل تعداد 39 ہے۔ طنزیات مانپوری، حصہ اوّل میں 13 انشائیے۔ طنزیات مانپوری، حصہ دوئم میں 12 انشائیے۔ مطائبات مانپوری میں 9 اور مرنے کے بعد میں 5 انشائیے شامل ہیں۔ اس طرح 13 +12+9+5=39 یعنی انجم مانپوری کے شائع شدہ انشائیوں کے مجموعے میں شامل ہونے والے انشائیوں یا طنزیہ ومزاحیہ مضامین کی کل تعداد 39 ہیں۔ لیکن میرا مطالعہ بتا تا ہے کہ مانپوری کے انشائیوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر ''ندیم'' کے جس اگست 1931ء کے شمارہ میں ''میر کلو کی گواہی'' شائع ہوا تھا اسی شمارہ میں مانپوری کا ایک انشائیہ ''سیاسی زبان'' میر کلو کی گواہی سے قبل صفحہ نمبر 15 سے 20 پر موجود ہے اور ''میر کلو کی گواہی'' صفحہ نمبر 57 سے 61 سے قبل یعنی ''میر کلو کی گواہی'' کے مقابلے اس انشائیہ کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ لیکن ''میر کلو کی گواہی'' نے جس طرح دھوم مچائی، اس کی شہرت کے آگے یہ انشائیہ پھیکا محسوس ہوا اور اسے کسی بھی مجموعہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ اسی طرح ''ندیم'' کے بہار نمبر ماہ، جولائی۔ اگست 1933ء کے شمارہ میں مانپوری کا ایک مضمون بہ عنوان ''معصوم ہستیاں'' شامل ہے۔ اس پر بھی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں کوئی محقق سنجیدگی کے ساتھ تلاش کرے تو ایسے بہت سارے انشائیے، مثال کے طور پر ان کے اپنے رسالہ ''ندیم'' میں سیاسی زبان، معصوم ہستیاں کے ساتھ ساتھ، عملی زندگی، بڑی مشکل ہے، الیکشن ورک، پنکھوں کی ٹھیکہ داری، رفیقۂ حیات، ہڑبونگ سبھا، ہمارے وکیل صاحب، نو وائی لینس، انہماک، عیادت، ہوائی جہاز، ہمدردان ملک۔ انجم مانپوری کی سرپرستی میں ہی گیا سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'کرن' میں موجود انشائیے، پیسر میاں، چند نئے ادیب، شیخ جمّن، کاروباری شادی، چاند سورج

۔ ان کے بعد انجم مانپوری کے دوست بسمل سنسہاروی کے رسالہ ''سہیل'' میں شائع ہونے والا انشائیہ ''رکشہ'' بھی قابل ذکر ہے۔ یہ وہ انشائیے ہیں جو انجم مانپوری کے شائع ہونے والے انشائیوں کے مجموعے میں شامل اشاعت نہیں ہیں۔ جس کی وجہ کر ان انشائیوں پر اب تک کسی نے گفتگو نہیں کی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوا گر کوئی ادارہ انجم مانپوری کے تمام انشائیوں کی کلیات شائع کر دے۔ افسوس کہ ان کے قریبی رشتہ دار قیوم خضر (مرحوم) کے صاحبزادے اظہار خضر نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''مانپوری احوال و آثار'' اور معین شاہد (مرحوم) کے پسر ڈاکٹر نعیم شاہد نے بھی اپنی مرتب کردہ کتاب ''میر کلّو کی گواہی...'' میں ان ہی انشائیوں کو شامل کیا ہے جو مذکورہ انشائیوں کے مجموعے میں شامل ہیں۔

انجم مانپوری کو شعر وادب سے دلچسپی بچپن ہی سے تھی۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی سے مانپوری کا اپنے کلام پر اصلاح لئے جانے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس لئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انجم مانپوری کے ادبی سفر کا آغاز تحصیل علم کے دوران ہی شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن طنز وظرافت کے میدان میں ان کے پہلے ہی طنزیہ ومزاحیہ مضمون ''میر کلّو کی گواہی'' کی شہرت نے ادبی دنیا میں دھوم مچا دیا اور پوری ادبی دنیا میں ان کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ اس سلسلے میں، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس زبردست خیر مقدم اور دھوم کے پیچھے ان کی شاہکار تخلیق کے ساتھ ساتھ ان کے ''ندیم'' جیسے مقبول اور اہم رسالے کا مدیر ہونا بھی شامل تھا۔ اس لئے میرے خیال میں انجم مانپوری کی ادبی زندگی خاص طور پر نثر کے میدان میں ان کا داخلہ اور باضابطہ آغاز 1931ء میں ہوتا ہے۔ جون 1931ء سے مانپوری نے مشہور ادبی ماہنامہ ''ندیم'' کا اجراء کیا اور اسی رسالہ میں اگست 1931ء کے شمارہ میں مانپوری کی شہرہ آفاق طنزیہ ومزاحیہ تخلیق ''میر کلّو کی گواہی'' کی اشاعت ہوئی۔ جس نے پوری اردو دنیا کو چونکنے پر مجبور کر دیا اور دیکھتے دیکھتے مانپوری شہرت اور مقبولیت کی بلندی پر پہنچ گئے۔ اس وقت سے مانپوری تا حیات اپنی بزلہ سنجی، شوخیِ تحریر، شگفتگی، برجستگی، حاضر جوابی، ذہانت، مطالعے کی گہرائی اور مشاہدے کی گیرائی کا ثبوت مختلف طنزیہ ومزاحیہ مضامین میں پورے اعتماد کے ساتھ دیتے رہے۔

مانپوری کی جتنی بھی طنزیہ مزاحیہ نثری تحریریں ہیں انھیں مختلف اصناف ادب میں رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ افسانے ہیں۔ کچھ لوگ انشائیہ قرار دیتے ہیں اور چند حضرات مضامین کہتے ہیں۔ اگر مانپوری کی تمام تر تحریروں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ

سب اپنے دور کے مطابق طنزیہ ومزاحیہ مضامین ہیں، جو بعد میں انشائیہ کے اندر اپنی جگہ بناتی ہیں۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ انشائیہ ادب کی ایک ایسی صنف ہے،جس میں لطافت، بزلہ سنجی، شگفتگی اور طنز وظرافت سے بھری تحریر ہو جورواں دواں ہو اور جس میں بے ترتیبی کا بھی اپنا مخصوص ربط وتسلسل ہو۔ ہم اس حقیقت سے انکارنہیں کر سکتے کہ جس وقت مانپوری نے لکھنا شروع کیا تھا'اس وقت تک اردو میں انشائیہ کی کوئی واضح شکل سامنے نہیں آئی تھی بلکہ اردو میں یہ صنف بالکل ابتدائی دور میں تھی۔ ویسے نامور نقاد کلیم الدین احمد نے صنف انشائیہ کی صنفی حیثیت سے ہی انکار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''یہ(انشائیہ)وہی صنف ہے جسے انگریزی میں ESSAY اور اردو میں مقالہ کہتے ہیں۔وہ مانتین ہو یا بیکن، اڈیسن ہو یا ڈاکٹر جانسن یا لیم یا اور کوئی انگریزی یا اردو کا مصنف'اس صنف میں وہ جو کچھ لکھے گا اسے ہم مقالہ کہیں گے انشائیہ نہیں۔مقالہ میں اتنی وسعت ہے کہ اس میں ہر قسم کے مضامین سما سکتے ہیں۔وہ سائنٹی فک ہوں، تاریخی ہوں، ادبی ہوں یا ہلکے پھلکے مضامین ہوں جن میں ظرافت بھی ہوسکتی ہے اور نکتہ سنجی بھی، رومانیت بھی اور جذباتیت بھی''

(نقد آزاد، آخر سرورق)

کلیم الدین احمد کی اس بات''مقالہ میں اتنی وسعت ہے کہ اس میں ہر قسم کے مضامین سما سکتے ہیں۔وہ سائنٹیفک ہوں، تاریخی ہوں، ادبی ہوں یا ہلکے پھلکے مضامین ہوں جن میں ظرافت بھی ہوسکتی ہے اور نکتہ سنجی بھی، رومانیت بھی اور جذباتیت بھی''سے میں اتفاق نہیں کرتا۔حقیقت یہ ہے کہ مقالہ جس طرح کے بہت ہی سنجیدہ اور فکری عوامل کا متقاضی ہے،ان میں ظرافت اور طنزیہ اظہار بیان قطعی طور فٹ نہیں بیٹھتا ہے۔ہاں مضمون میں کسی حد تک اس کی گنجائش ممکن ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب انجم مانپوری یا ان کے ہم عصر طنز وظرافت کے دامن کو وسیع کر رہے تھے،اس وقت تک انشائیہ کی واضح شکل سامنے نہیں آئی تھی۔اس لئے ایسی طنز وظرافت سے بھری نثری تحریر کو مضامین کے زمرے میں ہی جگہ دی گئی تھی۔خود انجم مانپوری نے اپنے طنزیہ ومزاحیہ تحریروں کو مضمون ہی کہا تھا۔انھوں نے اپنے ذاتی احوال کا ذکر کرتے ہوئے اپنے تیسرے مجموعہ''مطائبات مانپوری''میں لکھا تھا:

''سابق پیشہ زمینداری و قدرے کاشتکاری۔ موجودہ مشغلہ صرف ادائے مالگذاری، کچہری کی بستہ برداری، وکلا اور عملوں کی ناز برداری اور گاہے گاہے مضمون نگاری''

اس مباحث کو زیادہ طول نہ دیتے ہوئے اس سلسلے میں ڈاکٹر سید محمد حسنین کی مشہور کتاب''صنف انشائیہ اور چند انشائیے'' کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کتاب میں نہ صرف کتاب کے مرتب ڈاکٹر سید محمد حسنین نے 1958ء ہی میں کئی مشاہیر ادب کے انشائیوں کی تلاش میں کامیاب ہوئے تھے اور انھیں اس مذکورہ کتاب میں شامل کیا تھا بلکہ ایک طویل اور بے حد اہم مقدمہ بھی لکھا تھا۔اس کتاب میں محمد حسین آزاد،عبدالحلیم شرر،خواجہ حسن نظامی،مرزا فرحت اللہ بیگ،ملاّ رموزی،رشید احمد صدیقی، حاجی لق لق، انجم مانپوری، پطرس(بخاری)، فلک نما، کرشن چندر، کنھیا لال کپور، شوکت تھانوی اور شاہ علی اکبر قاصد کے دو دو انشائیے شامل کرتے ہوئے نہ صرف انشائیہ کو پورے طور پر متعارف کرایا تھا نیز اس کی تعریف بھی بیان کی تھی۔اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن(اکتوبر1963ء) کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب کا پیش لفظ سید احتشام حسین نے لکھا ہے۔جس میں انھوں نے انشائیہ کے سلسلے میں اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے مشورہ دیا ہے کہ....

''انشائیہ ذاتی تاثر ہے یا فلسفیانہ خیال آرائی، محض انشا پردازی کا طلسم ہے یا معنی خیز اظہار خیال، محض سرسری اور سادہ اظہار تاثر ہے یا رنگین اور فکر خیز ادبی تخلیق۔اس طرح کی بہت سی نازک بحثیں اٹھائی گئی ہیں اور اب تک کوئی آخری بات اس سلسلے میں نہیں کہی گئی ہے۔اگر کسی نے بحث مباحثہ کے بعد کوئی نتیجہ نکال بھی لیا ہے تو اس پر پورے ہونے والے صرف چند مضامین ملے ہیں جنھیں اس نے اپنے نقطۂ نظر والے انشائیوں کی فہرست میں شریک کرنا مناسب سمجھا اور بات محض ذاتی پسند کی ہو کر رہ گئی۔

اگر کسی کو اس بحث سے دلچسپی ہو تو وہ وزیر آغا کی خیال پارے، نظیر صدیقی کی کتاب تاثرات وتعصّبات، انھیں کا مجموعۂ مضامین شہرت کی خاطر، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کا انتخاب اردو سیریز، مولوی صفی مرتضٰی کی کتاب اردو انشائیہ اور ادیب علی گڑھ کے انشائیہ نمبر(مرتبہ قمر رئیس) کا مطالعہ کرے۔اس کی سمجھ میں کم از کم بحث کے وہ سارے پہلو سامنے آجائیں گے جن کے جاننے کی ضرورت ہے۔''

(صنف انشائیہ اور چند انشائیے، صفحہ:11)

ڈاکٹر سید محمد حسنین نے اپنی اس کتاب میں یوں تو انشائیہ کے ضمن میں لمبی بحث کی ہے اور

میرے خیال اس طویل بحث میں انشائیہ کی تعریف وہ ان الفاظ میں پیش کرتے نظر آتے ہیں.....

''انشائیہ کی تعریف یعنی Subjetivity کا ہونا شرط ہے۔ یہ داخلیت انشائیہ نگار کے ذاتی تاثرات کی غماز ہوتی ہے۔ یہ اس کے مشاہدہ، کثرت مشاہدہ، کا ثبوت دیتی۔ یہ داخلیت مجرّد نہیں ہوتی۔ یہ خارجی کوائف سے آلودہ ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار کا مقدس فریضہ آوارہ خیالی اور شگفتہ بیانی ہے۔

(ایضاً صفحہ:25)

ڈاکٹر سید محمد حسنین نے اپنی مذکورہ کتاب میں انشائیہ کے سلسلے میں ایک بڑی اہم اور تاریخی بات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اردو میں انشائیہ کو صنفی لحاظ سے سب سے پہلے ڈاکٹر اختر اورینوی نے ادب میں روشناس کرایا۔ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔(ایضاً صفحہ؛ 35)۔ وہ آگے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ سید شاہ علی اکبر قاصد کا کئی چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے نہایت ہی دلکش مضامین کا مجموعہ ''ترنگ'' منظر عام آیا تھا۔ جو کہ مکتبۂ خیال، سبزی باغ، پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔ اس ''ترنگ'' کا مقدمہ اختر اورینوی نے لکھا تھا اور یہ مقدمہ صنف انشائیہ پر اردو کا پہلا مقالہ تھا۔ لفظ انشائیہ فاضل مقدمہ نگار کی طبّاعی کا نتیجہ تھا۔ اردو دنیا اس نوع کی تحریروں سے ناواقف نہ تھی، مگر یہ لفظ بالکل نامانوس تھا اور اسے قبول عام کی سند حاصل نہ تھی۔ یعنی ڈاکٹر سید محمد حسنین کے خیال میں 1942ء میں ہی اختر اورینوی نے اس صنف انشائیہ کو متعارف کرایا تھا۔ ڈاکٹر حسنین نے اپنی اس مذکورہ کتاب میں انشائیہ نگار شاہ علی اکبر قاصد کے دو انشائیے ''موٹر سائیکل'' اور ''چھینک'' کو آخر میں شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین شروع سے ہی انجم مانپوری کے انشائیوں کے مداحوں میں رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی انھوں نے اپنی ایک دوسری کتاب ''بہار کے نو چراغ'' میں انجم مانپوری اور ان کے انشائیوں کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ ''مانپوری ایک اچھے اور مقبول انشائیہ نگار ہیں اور ان کے انشائیے اردو کے چند معیاری انشائیوں پر پورے اترتے ہیں''

اس لئے میرا خیال ہے کہ انجم مانپوری کی طنزیہ مزاحیہ تحریروں کو افسانہ' مقالہ، انشائیہ کی بحث میں الجھے بغیر طنزیہ ومزاحیہ مضمون یا انشائیہ کہا جائے یا مان لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس سیاق وسباق میں اب ہم انجم مانپوری کے انشائیوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ انجم مانپوری کا پہلا طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا انتخاب ''طنزیات'' (حصہ اوّل) کے نام سے 1938ء میں شائع ہوا۔ جس میں میر

کلّو کی گواہی، ماما کی مصیبت، میری اسیری، ہاں میں ہاں، میرا روزہ، سکنڈ ہینڈ موٹر، پاگل خانہ کی سیر، شادی کی تقریب، پنک آشرم، اڈیشنل وائف، میونسپل الیکشن، ہاتھی اور کرایہ کی ٹم ٹم کے عنوانات سے تیرہ مضامین 314 صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا مقدمہ سید وصی احمد بلگرامی، ڈپٹی کلکٹر پلاموں نے لکھا تھا۔ انجم مانپوری کی اسی تصنیف یعنی ''طنزیات مانپوری'' حصہ اوّل کو 1990ء میں ٹی جے پبلی کیشنز، اورنگی ٹاؤن، کراچی، پاکستان کے پبلشر محمد سراج نے شائع کرایا تھا۔ ''طنزیات مانپوری'' کے حصہ اوّل کا مقدمہ طنزیات مانپوری کے عنوان سے صفحہ 1 سے 59 صفحات پر سید وصی احمد بلگرامی، ڈپٹی کلکٹر، پلاموں کا فرہنگ مانپوری کے ساتھ ذرا مختلف انداز کا مقدمہ ہے۔ مقدمہ کے ابتدائی صفحات پر دبستان دہلی اور لکھنؤ کو اہمیت دئے جانے اور دبستان عظیم آباد کو نظر انداز کئے جانے کا شکوہ ہے۔ اس شکوہ کا اظہار بڑے دلچسپ انداز میں دو چیونٹیوں کے درمیان مکالمہ زبان دانی کے تعلق سے خوب صورت انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ ایک اقتباس دیکھئے:

''ایک چیونٹی: نازک خیالی، بلند پروازی، مضمون آفرینی، حدت طرازی اور سخن سنجی میں عظیم آباد کے شعراء سے کبھی پیچھے نہیں رہے۔ مگر بایں ہمہ یہاں کے لوگ اہل زبان نہیں تسلیم کئے گئے اور یہاں کی زبان دلّی اور لکھنؤ والوں کے نزدیک مستند نہیں سمجھی گئی.....اس بات کو ہم تسلیم نہیں کر سکتے کہ باعتبار زبان دانی کے اہل عظیم آباد کو اہل زبان کی صف میں کوئی جگہ نہیں دی جا سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ چونکہ یہاں بعض خاندان دلی کے سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض لکھنؤ کے سلسلہ میں داخل ہیں۔ اس لئے عام طور پر یہاں کی زبان دلّی یا لکھنؤ کی زبان سے لگّا نہیں کھاتی (مگر) انھیں وجوہ کی بنا پر عظیم آباد کو یہ خاص اختیار حاصل ہے کہ اس مرکز پر دلّی اور لکھنؤ کی زبان وشاعری کا باہم اجتماع اور اختلاط ہو جانے کے باعث یہاں شاعری کا ایک تیسرا متوسط اسکول اپنی جگہ پر قائم ہو گیا اور یہاں کی زبان کے اکھڑ پن اور لکھنؤ کے زنانہ پن کے درمیان مصداق خیرُ الاموُرِ اَوسطھُا اوسط درجہ کی اردو شمار کی جا سکتی ہے۔''

دوسری چیونٹی: اردو زبان کے عروج کا زمانہ دلّی اور لکھنؤ میں تھا بعینہ وہی صوبہ بہار میں تھا اور یہ بات اہل ادب میں بے تامل مانی جاتی ہے کہ دلّی اور لکھنؤ کے بعد اس زبان کا تیسرا مرکز عظیم آباد پٹنہ تھا۔''

(طنزیات مانپوری۔ پاکستانی ایڈیشن،صفحہ:7-6)

سید وصی احمد بلگرامی کے اس مضمون میں انجم مانپوری کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ کے بہار نمبر 1934ء اور 1935ء کے حوالوں میں سید سلیمان ندوی، مناظر احسن گیلانی اور رخشان ابدالی کے مضامین کے حوالے دئے گئے ہیں۔ وصی بلگرامی نے بہار کو نظر انداز کئے جانے کا شکوہ کئے جانے کے ساتھ ساتھ پٹنہ سے سید رحیم الدین استھانوی اور مولوی سعادت علی کی ادارت میں 5 رفروری 1885ء سے شائع ہونے والے ''الپنچ'' کو لکھنؤ سے شائع ہونے والے ''اودھ پنچ'' پر ترجیح دئے جانے کا بھی شکوہ اس انداز سے کیا ہے۔

''پانچویں چیونٹی: لکھنؤ سے اودھ پنچ نکلا، عظیم آباد سے الپنچ نکلا۔ اودھ پنچ نے ۳۶ برس خدمت کی۔ الپنچ نے ۲۶ برس خدمت کی۔ جیسا منشی سجاد حسین کا کوروی کا ویسا ہی رحیم الدین استھانوی کا شمع اردو کا پروانہ وہ بھی شمع اردو کا پروانہ یہ بھی، محسن الملک وہ بھی محسن الملک یہ بھی۔ مگر اس کو کیا کہئے کہ کاکوروی محسن الملک کا شور ہے اور استھانوی محسن الملک کا گنج شہیداں میں بھی سراغ نہیں ملتا۔ مرزا مچھو بیگ عاشق لکھنوی (ستم ظریف) کو بزم ادب میں جگہ دی گئی اور سید مہدی حسن خاں شاداب مظفر پوری (والد حقانی) کو دنیا بھول گئی؛۔''

(ایضاً صفحہ:9-8)

یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ انجم مانپوری کا دور طنز و مزاح کا سنہری دور تھا۔ اس دور میں ملک کے کئی مقامات سے طنز و ظرافت پر مخصوص اخبارات شائع ہو رہے تھے۔ اودھ پنچ، الپنچ کے ساتھ ساتھ گیا سے شائع ہونے والا ہفتہ وار 'گیا پنچ' (1894ء) اور اس کے بعد 'ہمزاد' وغیرہ نے طنز ظرافت کی صنف ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جس کی تفصیل کئی جگہ موجود ہے۔

بہر حال انجم مانپوری کے اس پہلے مجموعہ مضامین (یا انشائیہ) ''طنزیات مانپوری'' کے مقدمہ کو سید وصی احمد بلگرامی نے چار حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں مقدمہ کی تمہید ہے۔ اس تمہید میں مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ آخر میں وہ لکھتے ہیں:

''صاحبو: اس کو طنزیات مانپوری نہ کہو، اس کو جادو کی پٹاری کہو، اس پٹاری میں بارہ تحریریں تھیں۔

میر کلو کی گواہی، ماما کی مصیبت، اور میری اسیری تین ۳، ہاں میں ہاں، میرا روزہ، اور سیکنڈ

ہینڈ موٹر تین ۳، پاگل خانہ کی سیر، پنک آشرم، اور اڈیشنل وائف تین ۳، میونسپل الیکشن، ہاتھی، اور کرایہ کی ٹمٹم تین ۳۔

مانپوری نے یہ بارہ تحریریں پٹاری میں ہمارے سامنے بند کیں۔ اب ہم پٹاری کھولتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ بارہ میں نو غائب ہیں اور تینوں کا نام بدلا ہوا:۔

پہلی تحریر :۔گلستاں مانپوری

دوسری تحریر:۔فرہنگ مانپوری

تیسری تحریر:۔چھپن چھُری

گلستاں مانپوری کے ہوتے اب کون کہہ سکتا ہے کہ مانپوری نے مکتب میں گلستان سعدی نہیں پڑھی تھی؟۔''

(ایضاً صفحہ:12-13)

وصی احمد بلگرامی سے ایک جگہ شاید چوک ہوگئی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا، پر نشان زد کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ انجم مانپوری کے اس پہلے ''طنزیات مانپوری'' میں شامل انشائیوں کی تعداد 12 نہیں بلکہ 13 ہے۔ وصی بلگرامی نے ایک انشائیہ، بہ عنوان ''شادی کی تقریب'' کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ ہی پاکستانی ایڈیشن میں اسے شامل اشاعت کیا گیا ہے۔

وصی بلگرامی نے اپنے اس مقدمہ میں انجم مانپوری کے بارہ انشائیوں کو جادو کی پٹاری کہتے ہوئے، انھیں تین حصوں میں منقسم کرتے ہوئے ''میر کلّو کی گواہی'' سے لے کر ''کرایہ کی ٹمٹم'' تک 12 انشائیوں کی گہرائی میں ڈوب کر طنز و ظرافت کے حاصل شدہ موتیوں (مانپوری کے تیر ونشتر) کو مندرجہ بالا عنوانات کے تحت یکجا کرنے کی مثبت کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر چند نمونے ملاحظہ کریں:

گلستاں مانپوری سے....

''میرا خیال ہے کہ ہندوستانیوں کے عام ازدواجی تعلقات کی انکوائری کے لئے اگر کوئی سائمن کمیشن مقرر کی جائے تو مشکل ہی سے کوئی بدنصیب ایسا ملے گا جو اڈیشنل بیوی کی خدمات سے

محروم ہو۔ص۱۹۹۔'' (صفحہ:34)۔

فرہنگ مانپوری سے......

۳. دُم چھلا: شادی کے بعد ولیمہ

۹. ہوم منسٹر: لیڈی مانپوری و ماما مانپوری

چھپن چھری سے....

۶. انھیں زبان دی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں مجھے صرف ووٹ دیجئے۔

۷. آپ ہاتھی سے کیوں گرے؟ کس طرح گرے؟ میں نے کہا آئندہ پھر کبھی گر کر بتاؤنگا۔

۱۲. بھائیو: گاندھی جی کا حکم ہے کہ شانتی کے ساتھ ہلاّ کرو۔

۲۱. ٹھہرو ٹھہرو: ہاتھی الار ہوا جارہا ہے ایسا نہ ہو بیلنس نہ رہنے کی وجہ سے الٹا جائے۔''

وصی احمد بلگرامی کے درج کردہ انجم مانپوری کے ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں ان کے طنز اور ظرافت کے نمونے کو دیکھ ان کی بزلہ سنجی، شگفتہ بیانی اور لطیف طبعی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جنھیں محنت سے سید وصی احمد بلگرامی نے یکجا کر انجم مانپوری کی صلاحیت، ذہانت، متانت، فصاحت، بلاغت، لطافت، ظرافت کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طنز و ظرافت کے حسن و معیار کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس فن میں پھوہڑ پن کی بجائے اعلیٰ صلاحیت اور تاثرات و مشاہدات کے بیان میں شگفتگی اور شائستگی بے حد ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ فنکار کے ظریفانہ مزاج و نفسیات کے باوجود سنجیدہ فکر و احساس کا مالک کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس امر کا اعتراف خود انجم مانپوری نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے۔

مانپوری مسخرہ پن کو نہیں کہتے مزاح   چاہئے سنجیدگی بھی کچھ ظرافت کے لئے

اس لئے انجم مانپوری کے طنز و ظرافت کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک طرف جہاں انجم مانپوری کے مطالعہ و مشاہدہ سے ان کے طنز کی چبھن کی کیفیات کو محسوس کیا جائے، وہیں دوسری جانب ان کی ظرافت کے فنکارانہ حسن و معنیٰ کے پرتو پر بھی خصوصی توجہ دیا جانا لازمی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بے حد ضروری ہے کہ مانپوری کے تمام انشائیوں کو اسی دور اور عہد کے سیاق و سباق میں

دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے، ورنہ بہت ہی اعلیٰ اور معیاری تحریریں بھی لایعنی محسوس ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مانپوری نے اپنے انشائیوں میں اپنے عہد کے سماجی، معاشرتی، تہذیبی، اقتصادی اور سیاسی حالات کے منظر نامہ کو اپنے مخصوص انداز میں دکھانے کے ساتھ ساتھ بدلتے وقت اور رجحان پر بھرپور حملہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے نظر آئے ہیں اور اپنے ظریفانہ اظہار بیان میں اپنے علاقے کی بولی کو بھی بڑی شائستگی سے پیش کیا ہے۔ لکھنؤ یا دلّی کی تصنع بھری زبان جو بہر حال مانپوری یا ان کے کرداروں کی زبان نہیں رہی۔ ان سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں ہاتھی کے سلسلے میں ''اُلار'' لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ یقینی طور بہاری لفظ ہے اور اس کا مفہوم بہار کے لوگ ہی بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ ایسے بہت سارے الفاظ انجم مانپوری کے یہاں بھرے پڑے ہیں۔ حالانکہ انجم مانپوری نے گیا سے لکھنؤ، ندوہ، کلکتہ اور لاہور تک کی خاک چھانی، جگہ جگہ کی زبان، تہذیب، حالات، قدریں، طرز رہائش وغیرہ کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا۔ بہت سارے تجربات سے گذرے اور ان تمام حالات واقعات اور حادثات کو اپنے انشائیوں کا موضوع بنایا اور کردار بھی ایسے پیش کئے ہیں جو تصوراتی نہیں بلکہ حقیقی اور جیتے جاگتے کردار ہیں۔ جن کی زبان بھی اپنے عہد اور ماحول کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ خاص طور پر اپنے علاقے کی مگہی زبان جو عام طور پر وہ بولتے اور سنتے تھے، ان کا بڑے ہی فنکارانہ انداز میں استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مانپوری کے کردار کی زبان اور محاورں کے ساتھ ساتھ یہاں کے رسم و رواج، رہن سہن اور طور طریقوں کا برجستہ اور برمحل استعمال کر مقامی زبان کو اپنے علاقے کی سماجی، سیاسی، تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی حالات اور مسائل کو بڑے انوکھے اور فطری تقاضوں کے ساتھ اپنے انشائیوں میں پیش کیا ہے۔ ان کے قریبی رشتہ دار اور ماہر لسانیات و صحافی قیوم خضر نے اپنی کتاب ''ارتعاش قلم'' میں انجم مانپوری کی مقامی زبان سے لگاؤ اور برتاؤ کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''مانپوری نے اپنے انشائیوں میں خاص طور پر مقامی مگہی الفاظ کا استعمال جس دھڑلے اور حسن و خوبی کے ساتھ کیا ہے، اس سے ان کی ذہانت و فطانت کے ساتھ ساتھ مقامی بولی سے دلی لگاؤ کا پتہ چلتا ہے اور اس کی بھی واقفیت ہوتی ہے کہ ان کی نظر جزئیات و تفصیلات پر کافی گہری ہے نیز چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ان کی ذہنی گرفت سے باہر نہیں۔ مگر نام نہاد ٹکسالی زبان جاننے والے جو کسی

مخصوص مقامی بولی سے واقف نہیں، وہ منہ بنا بنا کر مانپوری کی زبان کا مذاق اڑا کر اپنی لاعلمی اور بد مذاقی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ حالانکہ زبان و بیان کی اسی خصوصیت نے ان کے انشائیوں میں انفرادیت کی وہ خوبی پیدا کر دی ہے جس سے مانپوریات کی پہچان ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض تنگ نظر قسم کے نقاد کا مذاق ہی بگڑا ہوا ہے تو اس میں مانپوری کا کیا قصور۔۔؟''۔

(صفحہ:138)

زبان و بیان کے تعلق سے انجم مانپوری کی جہاں ایک طرف مقامی زبان اور محاورے کے استعمال کو ان کی انفرادیت سے تعبیر کیا جا رہا ہے، وہیں اسے دوسری طرف ان کی کمزوری اور خامی بتائی گئی ہے۔ بہرحال میرے خیال میں کسی بھی کردار کی زبان و بیان وہی ہونے چاہیے، جو کردار کے سماج اور ماحول سے ہم آہنگ ہو۔ مانپوری نے اپنے بعض کرداروں کی زبان و بیان میں مقامیت کو ترجیح دی ہے تو یہ اس کا تقاضہ رہا۔ یہی وجہ رہی کہ کردار نگاری کے معاملے میں بھی مانپوری پطرس، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی وغیرہ سے کہیں کم نہیں نظر آئے۔ ان کے صرف ایک کردار ''میر کلو'' کو لے لیا جائے جو کسی بھی لحاظ سے خوجی، حاجی بغلول اور چچا چھکن وغیرہ جیسے مشہور کریکٹر سے کم متحرک نہیں اور اس کردار کو ابھارنے میں مانپوری نے اپنی بے پناہ فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ مانپوری کی کردار نگاری کا کمال تھا کہ انجم مانپوری نے طنز و ظرافت کا سفر جس انشائیہ ''میر کلّو کی گواہی'' سے شروع کیا، وہ کردار نگاری کا ہی شاندار مرقع تھا اور اپنے کردار کی وجہ سے ہی دیکھتے دیکھتے پوری ادبی دنیا پر چھا گیا۔ اس انشائیہ کے اس مخصوص کردار میر کلّو کی حاضر جوابی اور اس حاضر جوابی میں اس کردار کی بذلہ سنجی، ذہانت، شگفتگی کا اظہار نہایت سادگی اور شائستگی کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کردار سے جو نہیں ملا ہے، اسے اس کردار سے ملنے کا تجسس ضرور ہو رہا ہوگا۔ اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کردار سے ملوایا جائے۔ حاضر ہے بطور نمونہ یہ ایک اقتباس، جس سے انجم مانپوری کی ذہانت، انداز بیاں اور مطالعہ و مشاہدہ کی گہرائی و گیرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور دوران مطالعہ بے اختیار ہنسی کو روکنا مشکل ہو جائے:

''میر کلو صاحب دروغ حلفی کے جرم میں ایک بار سزا پا چکے تھے اس لئے پہلا سوال ان سے یہی کیا گیا۔

وکیل: میر کلو صاحب! آپ کبھی جیل کی بھی سیر کر آئے ہیں؟

میر صاحب: آج کل کون ملک کا خادم ایسا ہے جو جیل سے نہ ہو آیا ہو؟

وکیل: آپ کو ملک کی کس خدمت کے صلہ میں یہ فخر حاصل کرنے کا موقع ملا؟

میر صاحب: وہی قانون شکنی۔

وکیل: کس قانون کے توڑنے کی خدمت آپ نے اپنے ذِمّہ لی تھی؟

میر صاحب: گاندی جی نے نمک کے قانون توڑنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور بعض لیڈروں نے جنگلات کے قانون کی خلاف ورزی کو اپنے ذمہ لیا۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ ضرورت ''قانون شہادت کی اصلاح'' کی ہے۔ اس لئے قانون شکنی کے لئے میں نے اس کو منتخب کیا۔

وکیل: کیوں میر صاحب؟ احسان علی مرحوم کو آپ جانتے تھے؟۔

میر صاحب! ائے حضور! جاننے کی ایک ہی کہی۔ ہم ایک جان دو قالب تھے۔

وکیل: ان کی عمر کیا تھی؟

میر صاحب: یہی تیس اور ساٹھ کے درمیان۔

وکیل۔ یہ تیس اور ساٹھ کے درمیان کہنے سے کام نہیں چلے گا صاف کہیے وہ بوڑھے تھے یا جوان؟

میر صاحب: عمر کے لحاظ سے تو بہت زیادہ بوڑھے نہیں تھے مگر اکثر بیمار رہنے کی وجہ سے بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔

وکیل: بال سفید تھے یا سیاہ؟

میر صاحب: نزلہ کی وجہ سے بال سفید ہو گئے تھے لیکن جب خضاب لگاتے تو جوان معلوم ہوتے تھے۔

وکیل: رنگ گورا تھا یا کالا؟

میر صاحب: نہایت گورے چٹے آدمی تھے لیکن وہی بیماری کی وجہ سے رنگ کچھ سانولا ہو گیا تھا۔

وکیل: لا بنے تھے یا ناٹے؟

میر صاحب: قد تو لانبا تھا، لیکن کمر جھک جانے کی وجہ سے ناٹے معلوم ہوتے تھے۔

وکیل: داڑھی بھی رکھتے تھے یا نہیں؟

میر صاحب: وہ عجب آزادوضع اور رندانہ مشرب کے آدمی تھے جی میں آیا تو چاروں ابروکا صفایا بول دیا اور کبھی داڑھی بڑھائی تو خواجہ خضر کو بھی مات دیدی۔''   (میر کلّو کی گواہی)

''میر کلّو کی گواہی'' بلاشبہ انجم مانپوری کی ایک شاہکار تخلیق ہے۔لیکن ان کے پہلے مجموعہ مضامین ''طنزیات مانپوری'' (حصہ اوّل) میں شامل دوسرے انشائیوں مثلاً، ماما کی مصیبت، کرایہ کی ٹم ٹم، سکنڈ ہینڈ موٹر، پاگل خانے کی سیر، میرا روزہ، پنک آشرم، ایڈیشنل وائف، میونسپل الیکشن وغیرہ جیسے مشہور انشائیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ان انشائیوں میں انجم مانپوری نے جس طرح اپنے گردوپیش کے سماجی، سیاسی ،تہذیبی، علمی مسائل پر ظرافت کی چاشنی کے ساتھ طنز کے نشتر چلائے ہیں۔وہ ان کے فکر وفن کے اعلیٰ نمونے ہیں، جن میں مانپوری کی ایک انوکھی شان اور انفرادی پہچان نمایاں ہیں۔

''ماما کی مصیبت'' میں ماما کی اہمیت کو جس انداز سے مانپوری نے اجاگر کیا ہے وہ ان کے تجربات ومشاہدات کا آئینہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ماما یعنی گھر کی خادمہ کی ضرورت، اور اہمیت کے ساتھ ان کے نخروں کو مانپوری نے اپنے جس مخصوص اور منفرد اسلوب میں بیان کیا ہے وہ انداز بیان مانپوری کا ہی حصہ ہے۔اس انشائیہ کے ابتدائی چند جملے ملاحظہ کریں اور مانپوری کے قلم کو داد دیں، لکھتے ہیں:

''خدا نہ کرے کہ کسی کے گھر میں بی بی ہو اور ماما ہو، ماما ہو اور بی بی نہ ہو تو چنداں تردد کی بات نہیں۔اگر بی بی اور ماما دونوں ہوں، لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ماما ہو خوش سلیقہ اور خوش پوش وضع تو بیگم صاحبہ کا ہمیشہ مشتبہ رہنا، نقل وحرکت، گفتگو اور نگاہ پر ہر گھڑی سنسر قائم رکھنا یقیناً ایک ایسا امر ہے ،جس سے ہر وقت نقص امن کا خطرہ لگا رہتا ہے اور قلبی کشمکش کی صورت میں ایک حد تک تکلیف دہ بھی ہے۔لیکن اس سے بڑھ کر ناقابل برداشت مصیبت ہوتی ہے، جب اہلیہ صاحبہ بلاشرکت غیرے گھر میں تنہا تشریف فرما ہوں اور ان کی حکومت اور غصہ برداشت کے لئے کوئی ماما نہ ہو........''

ان چند جملوں سے ہی مانپوری نے ایسی فضا تیار کر دی کہ قاری آگے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ان چند جملوں میں ہی تجسس اور تحیر جاگ جاتا ہے اور مزاح کی پھلجھڑیوں میں دلچسپی اور انہماک اس طرح بڑھتا جاتا ہے کہ قاری اس میں ڈوبتا چلا جاتا ہے بلکہ بعض ایسے لوگ جو ایسے حالات سے گزرے ہیں انھیں ان جملوں میں اپنا عکس بھی بے اختیار نظر آنے لگتا ہے کہ ایسے واقعات تقریباً ہر گھر میں رونماء ہوتے ہیں، بس انھیں کوئی اس قدر خوش اسلوبی سے بیان کرنے والا نہیں۔اب دیکھئے کہ

ایک دن بقول مانپوری خود خاکسار کی بیگم صاحبہ نے برافروختہ ہو کر میری مرضی کے خلاف خدا جانے کس شبہ میں نصیبن ماما کو جواب دے دیا۔ ماما کے جانے کے بعد نئی ماما کی تلاش وجستجو شروع ہوتی ہے ۔ ماما کی اس تلاش کا بیان اس قدر دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ہنسی روکے نہیں رکتی، خاص طور پر جب ایک ماما مل جاتی ہے اور اسے جس انداز سے ڈولی میں بٹھا کر مانپوری لاتے ہیں۔اس منظر کا تصور ہی قہقہے لگانے کو مجبور کر دیتا ہے۔یہ ایک اقتباس دیکھئے:

''دو روز ہو گئے اور ابھی تک کوئی ماما تلاش نہیں کی گئی اور میرا خیال یہ ہے کہ وہ عتاب کرنے میں حق پر تھیں۔اب درودیوار سے قطع نظر کرتے ہوئے ان کا غصہ برداشت کرنے کا گھر میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔لیکن میں اپنے دماغ میں یہ مسئلہ حل کر رہا تھا کہ ماما کی جستجو کو انھوں نے ایک معمولی اور آسان کام کیوں سمجھ رکھا ہے؟ یہ بھی کیا شادی کے لئے بی بی کی تلاش ہے کہ دو چار احباب سے تذکرہ کر دیا، پلٹ پیام آنے لگے۔ پھر جتنی بیبیاں چاہیں بیاہ لیں۔ ماما کی دستیابی اور وہ بھی ان شرائط سے کہ:۔

چالیس سے کم سن نہ ہو، شوخ ووضعدار نہ ہو، پھر شوہر والی بھی ہو۔''

(ماما کی مصیبت، صفحہ:71-70)

انجم مانپوری نے اپنے اس انشائیہ میں مزاح کے ان منظر نامے کے بعد طنز کا تیر کس طرح اپنے ترکش سے نکال کر برساتے ہیں، یہ دیکھئے اور انجم مانپوری کی ذہانت اور فصاحت کی داد دیجئے:

''ملک کی غریب آبادی افلاس کی وجہ سے بھوکوں مر رہی تھی۔

ماماؤں کے نہیں رہنے کی وجہ سے اب خوش حال طبقہ کو بھی کئی کئی شام تک پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔اگر یہی حالت رہی تو بھارت کے بہت سے سپوت، گھر کا پکا ہوا کھانا نہیں ملنے کے باعث کمزور ہو کر عدم تشدد میں ڈنڈے کھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔''

ماما کی مصیبت ختم نہیں ہوتی ہے۔ بڑی مشکلوں سے ان کے ایک دوست نے ایک ماما دریافت کیا۔سارا معاملہ طئے ہو جانے کے بعد جب وہ اسے ڈولی میں پردوں کے ساتھ بٹھا کر جس طرح لاتے ہیں۔ یہ پورا منظر ایسا ہے جس میں پڑھنے والا لوٹ پوٹ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔گھر میں ماما کے آنے کے بعد پردہ میں رہنے والی اس ماما نے جو مصیبت کھڑی کی، وہ منظر بھی پرلطف اور مزاح

سے بھرپور ہے۔

انجم مانپوری کے طنز و مزاح کی اہم خوبی یہ بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ انجم مانپوری کے کسی بھی طرح کے اظہار میں پھوہڑپن، سطحیت اور اوچھاپن نظر نہیں آتا۔ ایک خاص انداز اور خاص پیرایہ میں وہ اپنی بات کرتے جاتے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو سوگر کوٹڈ گولیاں کھلاتے جاتے ہیں۔ سماج اور معاشرے میں پھیلی پراگندگی اور کثافت پر وہ اس طرح وار کرتے ہیں کہ پڑھنے والا سوچتا رہ جائے اور قاری کی یہی سوچ اور فکر انجم مانپوری کی کامیابی کی ضمانت بن جاتی ہے۔

انشائیہ ''سکنڈ ہینڈ موٹر'' بھی انجم مانپوری کے مشہور اور پرلطف انشائیوں میں شمار ہوتا ہے۔ گرچہ میرے خیال میں اس کے ابتدائی جملوں میں جس طرح وہ اپنے خاص کردار خاں صاحب کی تفصیل بیان کرتے ہیں، وہ قاری کو اکتاہٹ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس طرح کی تفصیلات، خامی بن کر ان کے بہت سارے انشائیوں کو متاثر کرتی ہیں۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے انشائیوں میں مرکب کی کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال اس انشائیہ ''سکنڈ ہینڈ موٹر'' میں بھی یہ کمی بہت ہی واضح طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس بلا وجہ کی تفصیل کے بعد ان کے طنز مزاح کا گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہے اور پڑھنے والا ہر جملے کے بعد مانپوری کی شگفتہ بیانی اور بذلہ سنجی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہتا۔ ''سکنڈ ہینڈ موٹر'' خریدنے کے بعد خاں صاحب جو کہ خود کو بظاہر بہت ذہین، سخی اور دوست نواز کے طور پیش کرتے ہیں۔ وہ کئی موقعوں پر ان ہی وجوہات کر پریشانی میں پڑتے ہیں کہ لوگ انھیں بے وقوف، کنجوس اور کم تعلیم یافتہ نہ سمجھیں۔ یہی وجہ رہی کہ ایک دن اپنے ایک دوست جمیل سے شکار پر جانے کے لئے موٹر مانگا، موٹر دو گھنٹہ قبل ہی ان کا ایک دوسرا دوست مانگ کر لے گیا تھا۔ یہ بات جمیل نے خان صاحب کو بتائی اور اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے معذرت کی۔ لیکن خان صاحب کو نہ جانے کیوں اس بات کا یقین نہیں ہوا اور انھیں لگا کہ جمیل ان سے موٹر نہ دینے کا بہانہ کر رہے ہیں۔ '' چنانچہ جمیل کو صاف صاف کہہ دیا کہ جیسے آپ ہی کے پاس دنیا میں موٹر ہے، نہیں دینا ہے تو صاف انکار کر دینے میں کوئی کیا آپ کا بگاڑ لیتا جو یہ بہانہ کر کے ہمیں بیوقوف بنانا چاہتے ہیں''۔ جمیل نے انھیں لاکھ یقین دلانے کی کوشش کی، قسمیں بھی کھائیں، لیکن خان صاحب کسی طرح یقین کرنے کو آمادہ نہیں تھے۔ تاؤ میں خان صاحب ٹیکسی لے کر شکار کرنے کو روانہ ہو گئے۔

لیکن ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جمیل کو اس کے انکار کئے جانے کی سزا دے کر رہوں گا۔ دراصل خان صاحب نے جمیل سے موٹر نہیں ملنے کو اپنی ہتک محسوس کی اور اس ہتک کا جواب دینے اور جمیل کو نیچا دکھانے کے لئے بنا دیکھے اور سمجھے بوجھے آخر کار ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر خرید لی۔ خریدنے کو تو خرید لیا اور اس سیکنڈ ہینڈ کار نے پورے شہر میں جو جو تماشے دکھائے اور ان تماشوں کو انجم مانپوری نے جس فنکارانہ حسن کے ساتھ دکھایا ہے انھیں دیکھ کر بے اختیار ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتی ہیں، پڑھنے والا لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ انجم مانپوری ظرافت بھری ان باتوں میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں شامل ملک کے نوجوانوں کی ہمت اور جرأت کی داد بھی دے جاتے ہیں:

''.....موٹر درست کر کے شام کو سیر کی غرض سے گرجا کی طرف چلے گئے، یہاں سے تو خیر خوبی کے ساتھ گئے لیکن واپسی میں ٹھیک ڈاکخانہ کے سامنے موٹر کے چکے کے نیچے بم پھٹنے کی آواز آئی۔ آپ جانتے ہیں کہ نون وائلنس لونڈوں نے آتش بازی کی طرح بمباری کو بھی کھیل بنا رکھا ہے۔ دعوتوں میں، جلسوں میں راستہ چلتے جب جی چاہا ایک بم چھوڑ دیا۔ ریل کی پٹری تک ان کی بم بازی سے محفوظ نہ رہ۔ ایسے نازک زمانہ میں قدرتاً ہمیں اس کا خیال ہوا کہ کہیں ہمارے موٹر کو بم سے اُڑا دینے کی سازش تو نہیں کی گئی۔''

''سیکنڈ ہینڈ موٹر'' کے خاص کردار خان صاحب نے سماج اور سوسائٹی میں خود کو بڑا آدمی دکھانے کے لئے کم قیمت پر بالکل ہی کھٹارا گاڑی لینے کو تو لے لیا، لیکن جیسی جیسی پریشانیاں اور ذلالت انھیں سکنڈ ہینڈ موٹر کی وجہ کر اٹھانا پڑی، یہ ان ہی دل جانتا ہے، لیکن سماج میں اپنا رعب اور رتبہ دکھانے کے چکّر میں یہ ساری پریشانی انھیں گوارہ کرنا پڑیں۔ یہاں تک کہ ان پر اسی کھٹارہ موٹر کی وجہ کر غلط ڈرائیونگ کا مقدمہ بھی چلا اور پچاس پچاس روپے کا کئی جرمانہ بھی ادا کرنا پڑا۔ ان تمام پریشانیوں اور مصیبتوں سے چھٹکارہ کے لئے آخر کار اس شکستہ حال سکنڈ ہینڈ موٹر سے نجات کے لئے خان صاحب نے میاں ضمیر کے اصطبل میں اسے پہنچوا دیا۔ اس کے بعد خاں صاحب کو سیکنڈ لفظ سے اس قدر شدید نفرت ہو گئی کہ یہ لفظ ہی انھیں منحوس لگنے لگا۔ خواہ وہ سیکنڈ کلاس مجسٹریٹ، سیکنڈ ہینڈ آفیسر، سکنڈ ماسٹر، سکنڈ اپیل وغیرہ۔ یہاں تک کہ وہ سکنڈ میرج کے بھی خلاف ہو گئے۔ سیکنڈ ہینڈ سے وہ اتنے متنفر اور بیزار ہو گئے جب کبھی کسی نے ان کے سکنڈ ہینڈ موٹر کا حال پوچھا، انھیں وہ بے نقطہ سنانا شروع کر

دیتے۔ یہ انشائیہ انجم مانپوری کے اپنے رسالہ 'ندیم' کے مارچ 1932ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔

مانپوری کے اس انشائیہ کا محرک دراصل دو واقعہ ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ ان کی بڑی دختر کی شادی کٹیہار کے ایک رئیس چودھری محمد ظہور سے ہوئی تھی۔ ان کے داماد نے انگریز کمپنی کا ایک سکنڈ ہینڈ موٹر خرید لیا تھا۔ اپنے اس سمدھیانہ میں انجم مانپوری کا اکثر آنا جانا ہوتا۔ ایک بار وہ اپنے اس سمدھیانے کی ایک شادی کی تقریب میں شرکت کرنے گئے ہوئے تھے اور اتفاق سے کسی جگہ جانے کے لئے اس سکنڈ ہینڈ موٹر میں انجم مانپوری بھی سوار ہوئے۔ واپسی میں اس موٹر (کار) نے آگے بڑھنے سے صاف انکار کر دیا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود اسٹارٹ نہیں ہوا، نتیجہ میں اسے کئی مزدوروں نے ٹھیلتے ہوئے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیابی نہیں ملی۔ تب مانپوری کو بھی اس موٹر سے اترنا پڑا اور وہ پیدل ہی چلنے پر مجبور ہوئے۔ اس تماشہ میں انجم مانپوری کی حس ظرافت کا پھڑکنا بالکل فطری تھا۔ دوسرا واقعہ ان کے ایک پڑوسی ایک خاں صاحب نبو میاں کا انھوں نے سکنڈ ہینڈ موٹر کے خریدنے کے بعد دیکھا۔ ان دونوں واقعات نے انجم مانپوری کے تخلیقی ذہن کو مہمیز کیا۔ جس کے نتیجے میں 'سکنڈ ہینڈ موٹر' جیسا طنز و مزاح سے بھرپور یہ انشائیہ وجود میں آیا۔ اس انشائیہ میں بھی انجم مانپوری کے ذہنی ترنگ اور تخلیقی زرخیزی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بات سے بات کس طرح پیش کی جائے اور اس میں طنز بھی ہو ظرافت کی چاشنی بھی موجود ہو، یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب ایسے تخلیق کار کے پاس عمیق مطالعہ و مشاہدہ کے ساتھ ساتھ الفاظ کا ذخیرہ ہو اور اظہار بیان پر قدرت حاصل ہو اور ان دونوں معاملے میں انجم مانپوری کو بڑی دولت حاصل تھی، جنھیں وہ دونوں ہاتھوں سے لٹاتے رہے۔ اب رہی بات پسند اور ناپسند کی تو، میری سمجھ یہ ہے کہ ہر فن پارے کا مطالعہ عصری سیاق و سباق میں کیا جانا چاہیے، تبھی اس کے اسرار و رموز کھلتے ہیں۔ اب اسی انشائیہ میں دیکھئے کہ کس طرح مانپوری نے نان وائلنس اور سوراج وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ تمام حالات اپنے وقت اور اپنے دور کو بیان کرتے ہیں۔ انھیں ہم اگر آج کے وقت اور حالات میں دیکھنے کی کوشش کرینگے تو یقیناً ہمیں یہ سب لایعنی محسوس ہوں گے۔

انجم مانپوری کے اس پہلے مجموعہ انشائیہ میں 'سکنڈ ہینڈ موٹر' کے بعد ہماری نظر بے اختیار 'پنک آشرم' پر ٹھہرتی ہے۔ جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

''لوگ کہتے ہیں کہ سارا عالم انقلاب پذیر ہے۔ ہمیشہ ایک حالت پر کوئی چیز نہیں رہتی، تغیر و تبدل ہر شئے کی فطرت میں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو فنافی الافیون میاں رمضانی کی چائے کی دوکان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ جو اپنی ابتدا آفرینش سے آج تک بلا تغیر و تبدل ایک حالت پر قائم ہے۔''

''پنک آشرم'' کے ان ابتدائی جملوں میں ہی انجم مانپوری نے اس بات کی جانب اشارہ کر دیا ہے کہ اس وقت سارا عالم انقلاب پذیر ہے، یعنی اس وقت پورا ملک سیاسی طور پر بے حد ہنگامہ خیز ہو رہا ہے۔ تحریک آزادی پورے شباب پر ہے۔ سیاسی و سماجی طور پر پورا ملک اپنی بیداری کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ لوگ اپنے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات کے لئے ہمہ وقت طرح طرح کی تحریک میں مشغول ہیں۔ ملک میں ہر طرف عدم تشدد، نمک تحریک، بدیشی بائیکاٹ اور سودیشی تحریک عروج پر ہے، آزادئ ہند کے لئے پورے ملک میں مہاتما گاندھی جوش و ولولہ اور ہمت و حوصلہ پیدا کرنے کے لئے مختلف نوعیت کی تحریک چلا رہے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ان تمام اہم فرائض، ذمّہ داریوں اور احساسات و جذبات سے بے خبر ملک کے اندر ایک طبقۂ افیونی ایسا بھی ہے، جو ان تمام وطنی حالات سے لاتعلق ہے اور وہ افیون کی مدہوشی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ انتہاء تو یہ ہے کہ یہ لوگ مہاتما گاندھی کی تحریک کو بھی ہدف ملامت بنانے سے نہیں چوکتے۔ بدیشی سامانوں کے بائیکاٹ کی گاندھی جی کی تحریک میں اس بات کی انھیں زیادہ فکر ستاتی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ ان کے افیون پر کسی طرح کی پابندی عائد کر دی جائے۔ 'پنک آشرم' کے اس پورے منظر نامہ میں انجم مانپوری نے افیونیوں کی پر مزاح گفتگو کے حوالے سے جو مزاح کی کیفیت پیدا کی ہے اور مزاح ہی مزاح میں جس طرح طنز کا وار کیا ہے۔ وہ نہ صرف انجم مانپوری کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہے بلکہ ان کی فنکارانہ عظمت کا واضح ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔ اس ضمن میں 'پنک آشرم' کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں، جو دلچسپی سے خالی نہیں:

''ان دلچسپ مناظر و کیفیات سے لطف انداز ہونے کا مجھے اکثر موقع ملتا رہا، چونکہ میں رمضانی کی دوکان حکیم حمید صاحب کے مطب کے مقابل واقع ہوئی تھی اور حکیم جی کے مطب میں شام کی حاضری میری معمول میں داخل تھی۔ گزشتہ ہفتہ ہی کا ذکر ہے کہ ایک روز حسب معمول حکیم صاحب کے مطب میں بیٹھا تھا بعض احباب کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا کہ یکا یک یہ سریلی آواز پنک آشرم سے میرے کانوں میں پہنچی۔'

'اماں مرزا؛ گاندھی جی کی نئی حرکتیں بھی تم نے کچھ سنیں' رمضانی کی دکان اور گاندھی جی کا تذکرہ، کوئی معمولی واقعہ نہ تھا، جس کی طرف میری توجہ مبذول نہ ہو جاتی، فوراً اس دلچسپ گفتگو کو سننے کے لئے ہمہ تن گوش بنکر بیٹھ گیا:

مرزا جھمن: کیوں بھئی میر صاحب: مہا تما جی نے کون سی نئی آنچ کی لی ان کے پاس برت کے سوا اب رہ ہی کیا گیا ہے اسی روزہ والی دھمکی کے بارہ میں تو نہیں کہتے۔

میر نجّو: واللہ مرزا جی آپ کی بھی کیا سمجھ ہے روزہ چھوڑا اگر گاندھی جی نماز بھی شروع کر دیں تو ہمارا کیا بگاڑ لیں گے؟ جس نئی اینچ کا تذکرہ میں کر رہا ہوں وہ ان کے دیسی مال کا بائیکاٹ کی تحریک ہے خاص ہندوستان کی پیداوار اس پر پکٹنگ کا حکم۔

مرزا جھمن: گاندھی جی اور سودیشی مال کے بائیکاٹ کا حکم یار تم بھی کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔

میر نجّو: قبلہ عالم: یہ افیون ہندوستان کی خاص چیز نہیں تو کیا ولایت کی پیداوار ہے، افیون کی دکان پر والینٹروں کا پہرا بیٹھا دینا کیا ہے۔

مرزا جھمن: ہاں واقعی تم نے سچ کہا ہے یہ کانگریسی لونڈے تو کسی افیون کی دکان کے پاس بھٹکنے بھی نہیں دیتے۔ کن کن مشکلوں سے کل دو روز کی خوراک بھائی گھسیٹا کی معرفت منگوائی ہے۔

گھسیٹا: کیوں جناب میر صاحب سب کام چھوڑ کر گاندھی جی اب افیون کے پیچھے کیا پڑ گئے۔

میر نجو: بھئی؛ بات اصل یہ ہے کہ سرکار سے مقابلہ کرنے سے رہے، اچھوتوں میں بھی اب دال گلتی نظر نہیں آتی اور مہا تما جی چین سے بیٹھنے والے آدمی تو ہیں نہیں، کچھ نہ کچھ انھیں کرنا بھی ضروری ہے، سب سے زیادہ کمزور، بے منہ کی جماعت ہم ہی لوگوں کو پایا اس لئے نرم چارہ سمجھ کر سارا نزلہ اسی طرف رجوع ہو گیا۔

بخشو: ابھی کیا ہوا ہے۔ آج افیون کی پکٹنگ ہے، کل بالائی پر بندش ہوگی، پرسوں گنّے پر پابندی عائد کی جائیں گی۔ اس کے بعد چائے کی دوکان پر پہرہ بٹھایا جائے گا۔ سرکار بدیسی ہو کر افیون کی ڈیوٹی کم کرے اور مہا تما جی اپنے دیش کے آدمی ہو کر افیون کی دکان پر پہرہ بٹھائیں۔

دلّو: جی ہاں افیون چھوڑنے سے گویا سوراج ہی مل جائے گا۔''

انجم مانپوری کے مطابق ملک کے لوگ ایک طرف اپنی آزادی کے لئے طرح طرح کے ایثار و قربانی پیش کر رہے تھے، لیکن ایک طبقہ افیونیوں یعنی سہل پسندوں، بے حسوں اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ملک اور ملک کے مسائل سے لاتعلق لوگ بس اپنے مفادات کے لئے پریشان تھے۔ انھیں گاندھی کی تحریک اور بڑھتے ہمنواؤں پر بھی اعتراض تھا۔ انتہا تو یہ تھی کہ تحریک آزادی کے متوالوں کے بار بار جیل جانے اور انگریزوں کے بڑھتے ظلم وتشدد کا مردانہ وار مقابلہ کرنا بھی انھیں ناگوار گزر رہا تھا۔ افیونیوں کو اپنے ملکی اختیار اور آزادی سے زیادہ ترجیح افیون کی دی جا رہی تھی، کہ خدا سرکار بہادر کو صحیح سلامت رکھے اور کچھ نہیں تو کم سے کم افیون تو کسی طرح مل جاتی ہے اور سچ پوچھئے تو ہمیں اختیارات سے زیادہ اسی کی ضرورت ہے۔ انجم مانپوری ان افیونیوں کے کردار کے ذریعہ بظاہر افیونیوں کی باتوں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت اس مزاح میں ایسے لوگوں پر اپنے ترکش سے طنز کا تیر برساتے ہیں، جو اپنی کاہلی، سستی، بے حسی سے اپنے ملک کو انگریزوں کی غلامی کی زنجیروں سے نجات دلانے سے زیادہ دلچسپی انھیں اس بات کی ہے کہ وہ آرام سے اپنی بے حس دنیا میں سکون و اطمینان سے رہیں۔ انجم مانپوری کے طنز کے ان بھرپور وار کو دیکھئے:

''گورنمنٹ برطانیہ اگر ہندوستان میں واقعی امن و امان قائم رکھنا چاہتی ہے تو ہر شہر ہر قصبہ میں کالج اور اسکول کی طرح اپنے خرچ سے پنک آشرم قائم کر کے افیون کی طرف لوگوں کو مائل کرے، تھوڑے ہی دنوں میں چسکا پڑ جانے پر خود ہی لوگ پرسکون و باامن بننے کی کوشش میں مصروف ہو جائیں گے۔

از ابتدائے میونسپلٹی لغایت کانسل آف اسٹیٹ کم سے کم 90 فی صدی سیٹ ہماری جماعت کو ملنی چاہئے کیونکہ سستی و کاہلی، غفلت و بے پروائی، بے حسی و کسر نفسی وغیرہ جو ہماری جماعت کی خصوصیت ہیں، ہندوستان کی 90 فی صدی آبادی ہمارے ان اوصاف مخصوصہ میں مشترک ہے۔ اس لئے بلحاظ آبادی 90 فیصدی نشستوں کا ہمارا مطالبہ اپنی جگہ پر ایک دم صحیح ہے۔''

مانپوری کا طنز کے ساتھ مزاح پیدا کرنے کا یہی وہ مخصوص انداز ہے، جو انھیں اپنے تمام ہم عصر انشائیہ نگاروں سے ممتاز اور منفرد بناتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کا یہ انداز میر کلو کی گواہی، یا پنک آشرم تک محدود ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے بیشتر انشائیوں میں طنز و ظرافت کی ایسی ہی کیفیات

دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے پہلے انشائیوں کے مجموعہ میں اس انشائیہ کے بعد ایک اور اہم انشائیہ ''ایڈیشنل وائف'' ہے۔ جس میں مشرقی ومغربی معاشرت وتہذیب کے تصادم کو بڑے ہی دلچسپ انداز میں دکھایا گیا ہے۔ ''ایڈیشنل وائف'' کا پہلا ہی پیراگراف یہ اشارہ کر دیتا ہے کہ انجم مانپوری جو بذاتِ خود مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے اور دینی نظریات کے زبردست پابند تھے۔ اس لئے ظاہر ہے ان سے مغربی معاشرے کی حمایت کیونکر ممکن تھی، وہ بھی اس زمانے میں جب ملک انگریزوں کے چنگل میں کراہ رہا تھا اور کچھ لوگ مغرب زدگی کے شکار ہو کر سماج میں خود کو بظاہر اعلیٰ اور بلند مرتبہ والا دکھانا چاہتے تھے۔ ''ایڈیشنل وائف'' کے اس پہلے پیراگراف کا یہ انداز بیاں دیکھئے:

''موجودہ اقتصادی تنزلی کی وجہ سے ہر ملک نے اپنے یہاں کی درآمد پر خاص خاص پابندیاں عائد کر رکھی ہیں تو ملکی مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے یہ بات اب تک سمجھ میں نہیں آئی کہ تعلیمی سلسلہ میں ہندوستانی نوجوانوں کو ایکسپورٹ امپورٹ (درآمد برامد) کیوں اس سے مستثنیٰ ہو۔ کیونکہ ملک کی یہ خام پیداوار ولایت جانے کے بعد کیمبرج اور آکسفورڈ کے کارخانوں میں انگلش میڈ یا ہو کر ہندوستان جب روانہ کر دی جاتی ہے تو کوٹھیوں اور بنگلوں کے نمائشی سامان بننے کے سوا کس مصرف کی ہوتی ہے؟۔''

''ایڈیشنل وائف'' کے ان ابتدائی جملوں میں انجم مانپوری نے جس طرح ظرافت کی چاشنی میں طنز کیا ہے وہ اس زمانے کے مغرب زدہ اور مغرب پرستوں کو بلبلانے اور تلملانے کے لئے کافی ہے۔ کیا زبردست انداز میں ملک کے مغرب پرست نوجوانوں کو ہدف ملامت بنایا ہے۔ ہدف ملامت بناتے ہوئے انجم مانپوری خود کو بھی نہیں بخشتے ہیں اور خود کو مذاق کا موضوع بناتے ہیں۔ ''اڈیشنل وائف''میں وہ اپنے آپ کو کس طرح ہدف ملامت بناتے ہیں، یہ اس اقتباس میں دیکھئے:

''....دور کیوں جائیے اسی خاکسار کو دیکھئے کہ میٹرک میں مسلسل کئی سال فرسٹ ڈویژن میں فیل ہونے کے سبب جو ہمیشہ کے لئے تعلیم سے اکزمپٹ (مستثنیٰ) کر دیا گیا تو علمی جوہر دکھلانے کا موقع تو ملا نہیں مگر صاحبیت میں خدا کے فضل سے آج بھی کسی اوکسن، کنٹب، علیگ سے کم نہیں۔ وضع اور فیشن تو خیر کوئی ایسی چیز نہیں۔ ایک جگہ جانگھیا اور ایک نیم آستین جسے انگریزی اصطلاح میں ہاف پینٹ اور ہاف شرٹ کہتے ہیں، پہن لیا اور صاحب بن گئے.......''

مانپوری اس کے آگے مغربی تہذیب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ پڑھے لکھے لوگوں کے نزدیک جب تک پرانے رسم ورواج کی دھجیاں نہ اڑائی جائے، قدیم روایت پر آوازے نہ کسے، مذہبی عقائد کا تمسخر نہ اڑایا جائے اپنی روشن خیالی کا ثبوت نہیں، جنٹلمین کہلانے کا مستحق نہیں اور واقعی اس آزاد خیالی کے زمانہ میں دقیانوسی خیالات و مذہبی روایات پر اڑے رہنا بھی ہے، ذرا جنٹلمینی کی شان کے خلاف۔ ترقی یافتہ یورپ کی اعلیٰ معاشرت کو چھوڑ کر سینکڑوں برس کی پرانی مشرقی تہذیب کو اس نئی روشنی کے زمانہ میں کیوں کوئی اپٹوڈیٹ جنٹلمین پسند کرے گا۔ ایسے اعتراف کے بعد انجم مانپوری پردہ سسٹم جو مشرقی خواتین کے لئے ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا ہے اور اس کے برخلاف مغربی یا مغرب زدہ خواتین کی بظاہر حمایت کرتے ہوئے مانپوری کس طرح اپنے خاص انداز میں طنز کا نشانہ بناتے ہیں، یہ دیکھئے: ''....اس آزادی کے دور میں جبکہ مغربی خواتین تھیٹر، سنیما سے لے کر بال روم (ناچ) تک مردوں کے دوش بدوش، سینہ بسینہ ٹانگ میں ٹانگ لڑاتی پھرتی ہیں تو مجھ سا مغربی تہذیب کا دلدادہ ہندوستانی عورتوں کو پردہ میں مقید رکھنا کب گوارا کر سکتا ہے۔ لیکن وہی اندرونی مجبوری کچھ ایسی حائل ہیں کہ باوجود ان تمام روشن خیالوں کے عملی قدم نہیں اٹھا سکتا مگر اس سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ میں پردہ کا حامی اور بے پردگی کا مخالف ہوں.....اب اس بدقسمتی کو کیا کروں کہ واسطہ ہے مجھے ایک نیٹو بیوی سے جو پرانے رسم ورواج کی سختی سے پابند اور پردہ کو نہ پوچھئے جان سے زیادہ عزیز رکھنے والی۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ بیگم صاحبہ زمانہ ہے آزادی کا پردہ میں قیدیوں کی زندگی گذارنے کا کیا حاصل؟ مگر ان کی سمجھ میں کاہے کو آئے، کہنے کو تو پڑھی لکھی اپنے کو کہتی ہیں مگر اردو فارسی کی تعلیم بھی کوئی تعلیم ہے........''

ایسے خیالات رکھنے والے اور بظاہر روشن خیال کے حامی خود ''میں'' یعنی انجم مانپوری کو جب اس بات کا احساس ہو گیا کہ پردہ میں رہنے والی اور دقیانوسی خیال کی حامی، نازک مزاج اور ضدی بیوی ہی خود کو جس دوام کی زندگی پسند کرے تو پھر وہ کیوں خواہ مخواہ ایسے قید و بند کی زندگی سے آزاد کرانے کی کوشش کریں اور جب ان پردہ نشینوں سے جنھیں موجودہ مغربی تہذیب سے کوئی واسطہ نہیں ہو، یہ سوال کیا جائے کہ آپ پردہ کے پیچھے کیوں جان دے رہی ہیں تو ان کا جواب ہوتا ہے کہ......

بیگم: پھر آپ نے وہی بحث چھیڑ دی، یہ پردہ آپ کا کیا بگاڑ رہا ہے؟

میں: کاش آپ آزاد خیال ہوتیں۔

بیگم: صرف خیالات میں آزاد یا افعال و حرکات میں بھی؟

اب ذرا پردہ نشیں بیگم کی ایسی سوچ پر اور ان کی ایسی حاضر جوابی اور مغرب پرستوں پر کئے جانے والے اس طنز کا جواب نہیں۔

جب انجم مانپوری اپنی بیگم کو آزاد خیال بنانے کی ہر کوشش میں ناکام ہو گئے تو آخر کار انھوں نے خارجی امور کے لئے ایک ایڈیشنل بیوی کی تقرری عمل میں لانے کی ضرورت محسوس کی۔ یوں بھی ان کے خیال میں ہر محکمہ میں کاموں کی زیادتی کے باعث ایک آدھ ایڈیشنل ہینڈ کا تقرر ہوتا ہی رہتا ہے۔ اپنی پرمانٹ بیوی کے علاوہ آؤٹ ڈور ورک کے لئے ایک ایڈیشنل وائف رکھنے کا فیصلہ وہ کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اس زمانے میں ہر شخص ایک ایڈیشنل وائف سے ڈائرکٹ یا اِن ڈائرکٹ تعلق ضرور رکھتا ہے۔ یہ تعلق اعلانیہ ہو یا خفیہ، تنخواہ کے ساتھ ہو یا آنریری، مستقل ہو یا ٹمپریری، معشوقہ، داشتہ، ماما کسی نہ کسی صورت میں ایک آدھ ایڈیشنل بیوی ضرور ہوتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس عام رواج میں ان کا کیا قصور تھا کہ وہ ایک عدد ایڈیشنل بیوی کی خدمات حاصل کرنے میں نہ لگتے۔ اس فیصلہ کے بعد اپنے اس مسئلہ کو انھوں نے اپنے چند مخصوص دوستوں کے سامنے رکھا اور دوستوں نے بھی خوب دوستی نبھائی۔ جلد ہی ایک ہسپتال کی نرس مس اینی جو پوری طرح روشن خیال، آزاد مشرب، مغربی تہذیب کی گرویدہ، یوروپین فیشن میں رہنے والی کا نام پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ مس اینی کو بھی اتفاق سے ایک آزاد خیال شوہر کی ضرورت ہے اور تم سے بڑھ کر آزادیٔ نسواں کا حامی شوہر اسے کہاں ملے گا۔ اس لئے تم دونوں کی جوڑی خوب جمے گی۔ بس اس کی پسند شرط ہے۔ یہ شرط بھی پوری ہو گئی اور مس اینی اور مانپوری کی دوستی بڑھتی چلی گئی کہ ایک دن مس اینی نے مانپوری کے گھر پر چائے پینے کی خواہش ظاہر کر دی اور اس ہونے والی ایڈیشنل وائف کی خواہش پر مانپوری نے جو اپنی کیفیت بیان کی ہے، اس میں پر لطف مزاح کی بارش کے ساتھ ساتھ طنز کے پتھر بھی برستے نظر آتے ہیں۔ یہ سب مل کر کبھی ہنسنے اور کبھی کف افسوس ملنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے ایک مغرب زدہ خاتون کا گھر پر تنہا آنا اور چائے ناشتے کا اہتمام اندرون خانہ سے بیگم کے علم میں لائے بغیر ممکن نہیں

تھا۔ ایسے میں مانپوری دونوں محاذ کو کس طرح جھوٹ اور فریب کے ساتھ سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ پورا منظر مانپوری کی فنکارانہ صلاحیتوں کا خوبصورت مرقع بن کر سامنے آتا ہے۔ گھر پر آئی ہوئی ہونے والی ایڈیشنل وائف کو اندروں خانہ کی بیگم کی خامیاں پر خامیاں بیان کرتے ہیں کہ گھر میں رہنے والی وائف، وائف تو نہیں مگر ہاں بیگم قسم کی ایک خاتون البتہ یونہی مد فاضل کے طور پر رہتی ہیں جو ایک دم جاہل مطلق ہیں۔ ایک حرف انگریزی نہیں جانتی، نئی تہذیب، نئے فیشن سے بالکل نا آشنا۔ اب آپ ہی بتائے کہ ایسی عورت کبھی وائف ہونے کے لائق ہو سکتی ہے؟ ادھر بیگم کو ان کے مقابلے مس اینی کی بدصورت شکل کو بتاتے ہیں کہ بالکل باورچی خانہ کی دیوار پر چونے کی قلئی ہے، کہہ کر بگڑتی بات کو بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت مانپوری کے بنے بنائے ہوائی قلعے منہدم ہو جاتے ہیں، جب اندرون خانہ کے دروازہ کی اوٹ سے بیگم باہر دروازے کی اوٹ پر کھڑی مس اینی مانپوری کی ساری بات سن لیتی ہیں۔ اس کے بعد کا بھیانک منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ مس اینی پیر پٹختی ہوئی خفا ہو کر قانونی کاروائی کی دھمکی دیتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی اور گھر کے اندر بیگم کا الگ غصّہ۔ بگڑتے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے آخر کار انھوں نے فیصلہ کیا کہ زن مرید بن کر ہی رہنا زیادہ بہتر ہے ایڈیشنل وائف رکھنے کے مقابلے۔ اس پورے ہنگامی حالات کے آخر میں انھیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ سستے داموں، (یعنی مس اینی کے مقدمہ پر جرمانہ ادا کرنے کے بعد) بیوی اور وائف کا فرق سمجھ میں آ گیا۔ یہ انشائیہ دراصل ان لوگوں پر ظرافت کے ریشمی پردے میں گہرا طنز ہے جو گھر کی چہار دیواری کے اندر رہنے والی وفا شعار بیگم اپنے پورے گھر کے نظام کو پوری ذمّہ داریوں کے ساتھ پورا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی ہیں، پھر بھی شوہر دوسروں کی بیویوں میں اپنی دلچسپی کے اظہار سے باز نہیں آتے۔ خاص طور پر اس دور میں جب مشرق اور مغرب میں تصادم زیادہ تھا۔ ملک میں انگریزوں کی حکومت تھی اور یہاں کے لوگوں کے لئے انگریزی معاشرت میں جینے والی خواتین ان کے خواب اور تصور میں ہمہ وقت بسی رہتی تھی اور اس کے لئے بڑے بڑے نواب، رؤسا اور زمینداروں نے اپنی پوری دولت لٹا دی۔ مانپوری نے اپنے اس انشائیہ میں ایک ایسے اہم موضوع کو چھوا ہے، جو اپنے زمانے کا بے حد اہم موضوع رہا ہے اور اس موضوع کے ایک پہلو کو گرفت میں لے کر مانپوری نے مغربی عہد کو پوری طرح بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ الگ

بات ہے کہ اس دور کا یہ موضوع عہد حاضر میں ہمارے سماج اور معاشرے میں پوری طرح اثر انداز ہو چکا ہے اور بہت اندر تک داخل ہو چکا ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مانپوری بلا کے ذہین تھے اور ان کی نگاہیں بہت دور تک دیکھ رہی تھیں۔

انجم مانپوری کا ایک اور انشائیہ ''کرایہ کی ٹمٹم'' بھی بے حد مقبول ہوا۔ یہ بھی انجم مانپوری کے ہی رسالہ 'ندیم' کے جنوری 1933ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس انشائیہ میں بات صرف اتنی ہے کہ مانپوری کو پٹنہ کے بانکی پور سے چند کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ریلوے اسٹیشن جانا ہے تاکہ وہ پٹنہ سے گیا جانے والی شام کی ٹرین سے اپنے شہر گیا پہنچ سکیں۔ اس زمانے میں تیز رفتار ٹمپو کی بجائے رکشہ یا پھر ٹمٹم ہی کی سواری کا عام رواج تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہوگا کہ ابھی حال حال تک سبزی باغ کی گلی میں داخل ہوتے ہی داہنی جانب ٹمٹم کا اڈہ تھا اسی طرح پٹنہ ریلوے اسٹیشن پر مسجد سے چند قدم کے فاصلے پر ٹمٹم کا اڈہ تھا، جہاں ٹمٹم کے رکنے اور گھوڑوں کے دانا پانی کا نظم ہوا کرتا تھا۔ بہرحال میرا دعویٰ ہے کہ ٹمٹم کی اس سواری کا جس طرح نقشہ کھینچا گیا ہے، وہ یقینی طور پر یہ بتاتا ہے کہ مانپوری نے بانکی پور سے اسٹیشن تک کا سفر ضرور ٹمٹم سے کیا ہوگا۔ ورنہ اس قدر جیتے جاگتے مشاہدہ میں اتنی زیادہ حقیقت بیانی کے عنصر نہیں ہوتے۔ اب ذرا غور کیجئے کہ مانپوری بانکی پور سے اسٹیشن جانے کے لئے ایسے مریل گھوڑے والی ٹمٹم پر سوار ہوتے ہیں، جس پر مزید سواری کا انتظار ہے اور ٹمٹم والا ہر آتے جاتے شخص کو اپنی سواری سمجھتے ہوئے اپنی ٹمٹم پر سوار ہونے کی دعوت دیتا جاتا ہے، ادھر تاخیر پر تاخیر ہونے کے باعث مانپوری کو اپنی گیا جانے والی ٹرین کے چھوٹ جانے کا خوف ستانے لگتا ہے۔ اس پریشانی کو مانپوری نے اپنے جس مخصوص اور منفرد انداز بیان سے پیش کیا ہے، اسے پڑھتے ہوئے بے اختیار ہنسی، قہقہے میں بدل جاتے ہیں اور میرے خیال میں مانپوری کا یہی فنی کمال ہے کہ وہ ایسے منظر نامہ میں اس طرح ہنسی مذاق کے رنگ بھرتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ کبھی طنز کے کبھی ہلکے اور کبھی تیز چرکہ بھی لگاتے جاتے ہیں۔ اس انشائیہ میں ویسے طنز کے مقابلے ظرافت کے گل و بوٹے زیادہ ہیں۔ لیکن مزاح سے بھرے طنز کے جو چند تیر ہیں، وہ سیدھے وار کرتے ہیں۔ یہ چند جملے دیکھئے:

''.....میں نے بگڑ کر کہا ریل کا وقت قریب ہے اس مریل گھوڑے کے پیچھے کیا اپنی ٹرین چھوڑ دوں؟ اس نے کہا میاں صاحب، یہ ذرا بیماری کی وجہ سے دبلا اور کمزور ہو گیا ہے ورنہ ایسا جیوٹ

کا گھوڑا ڈھونڈے نہیں ملے گا۔ دیکھا نہیں کیسا کس کس کے بیسیوں چابک پڑے مگر سوائے دولتیاں جھاڑنے کے چوں تک نہیں کی۔ میں نے کہا مگر ایسا ثابت قدم گھوڑا تو نون وائلنس والینٹروں کی سواری کے لائق ہونا چاہئے، جو ڈنڈے اور ہنٹر کھا کر بھی قدم نہیں اٹھاتا۔ اس ٹمٹم میں جوت کر خواہ مخواہ ایسے بہادر گھوڑے کی تم نے مٹی پلید کی ہے.....''

چھوا چھوت سے بھرے معاشرے پر وہ کس انداز سے حملہ کرتے ہیں، یہ دیکھئے:

''..... پنڈت جی نے اپنے دامن سنبھالتے ہوئے ذرا کھسک کر پوچھا تو کیا تم دھوبی ہو؟ اس نے کہا جی ہاں مگر اور دھوبیوں کی طرح معمولی نہیں، میں اشراف دھوبی ہوں۔ حاکموں اور امیر سیٹھوں کا کپڑا دھوتا ہوں۔ اتنا سننا تھا کہ پنڈت جی آپے سے باہر ہو گئے۔ غصہ میں فرمانے لگے کہ اچھوت دھوبی ہو کر برہمن کے ساتھ برابر بیٹھنے کی تجھے کیسے ہمت پڑی۔ ہمارا شہر ہوتا تو اس شوخی کا مزہ چکھا دیتے اور پھر ہم لوگ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ آپ لوگوں کو اختیار ہے چمار دھوبی جس کو چاہیں ساتھ بٹھائیں۔ میں شدروں کے ساتھ اپنے کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا۔''

انجم مانپوری اپنے اس انشائیہ میں شدروں کے لئے ڈاکٹر امبیڈکر کے ذریعہ ریزرویشن کا اور مہاتما گاندھی کے ظلم و ناانصافی کے خلاف رکھے جانے والے برت کا بھی حوالہ کس خوبصورتی اور گہرے طنز و مزاح کے ساتھ فنکارانہ انداز سے لاتے ہیں، یہ ایک منظر دیکھئے:

''اچھوتوں کے ساتھ آپ کا یہ برتاؤ اگر گاندھی جی کو معلوم ہو گیا تو برت رکھ رکھ کر ناک میں دم کر دیں گے اور جو کہیں ڈاکٹر امبیڈکر کو خبر لگ گئی تو آپ جانئے کہ شدروں کا یہ گروگنٹھال کونسل کے علاوہ ٹمٹم کیلئے بھی ریزرو سیٹ پر اڑ جائے گا۔''

ایسے طنز آمیز جملوں کے ساتھ ساتھ مانپوری کا حسِ مزاح کس طرح پھڑکتا ہے، اس کا ایک نمونہ ملاحظہ کریں:

''مجھے یقین ہو گیا کہ ٹمٹم پر اسٹیشن تک پہنچنے کے عوض کھٹولی پر ہسپتال جانا پڑے گا، لیکن خدا جانے کیا ہوا کہ تھوڑی ہی دور جا کر اچانک خود بخود گھوڑا اس طرح کھڑا ہو گیا کہ گویا ٹمٹم کے شوفر نے یکا یک بریک کس دیا، ساتھ ہی پٹرول کے بہنے کی سی آوازیں کانوں میں آنے لگی، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گھوڑے صاحب دفعہ ۳۴ کی خلاف ورزی میں مصروف ہیں، یعنی بیچ سڑک پر استنجا فرما

رہے ہیں۔''

''کرایہ کی ٹمٹم'' کا پورا سفر اتنے دلچسپ اور حقیقت سے بھرا ہے کہ جس نے بھی اس انشائیہ کو پڑھا، وہ محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اگر پڑھنے والے نے سبزی باغ سے اسٹیشن تک کا سفر ٹمٹم سے، جو پہلے عام طور پر یہی سواری ہوا کرتی تھی، وہ حقیقت حال کا اتنا انوکھا اور لوٹ پوٹ کر دینے والے انداز بیان سے مزید لطف اٹھایا ہوگا۔ اس پورے انشائیہ میں شروع سے آخر تک ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتی ہیں۔ انجم کا ایک ایک جملہ کبھی طنز اور کبھی مزاح سے اس طرح بھرا ہوا سامنے آتا ہے کہ قاری ہر پل دل میں گدگدی محسوس کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے، یہی وہ منفرد رواں دواں انداز ہے جن سے قاری ایک پل کے لئے رکتا نہیں اور آخری جملہ پڑھنے کے بعد بھی لگتا ہے کہ یہ سفر مزید طویل ہوتا۔ اس انشائیہ میں مانپوری کا صرف یہ ایک جملہ پڑھئے اور مانپوری کے حسِ مزاح اور ذہانت کو داد دیجئے:

''...ان کی اس مسافر نوازی پر بے ساختہ میری زبان سے نکلا کہ خدا آپ کو گھوڑے کے ڈاکٹر سے ہاتھی کا سول سرجن بنا دے''

کرایہ کی ٹمٹم سے کسی طرح اسٹیشن تو مانپوری پہنچ گئے، لیکن تمام کوششوں کے باوجود نظروں کے سامنے سے ہی ریل گاڑی چل دیتی ہے۔ اس بے بسی کے عالم میں ان کا ایک جملہ ایک بار پھر ہنسنے پر بے اختیار مجبور کر دیتا ہے، یہ دیکھئے:

''سب سے کہہ دیجئے گا کہ خیر و عافیت سے اسٹیشن تک پہنچ گیا........''

انجم مانپوری کے اپنے رسالہ ''ندیم'' کے جنوری 1933ء میں شائع ہونے والا یہ انشائیہ ''کرایہ کی ٹمٹم'' بھی انجم مانپوری کے ان چند انشائیوں میں ہے جو شائع ہونے کے بعد مسلسل دھوم مچاتا رہا اور لوگوں تک جیسے جیسے اس انشائیہ کا دلچسپ مزاح اور طنز کے وار کی خبر لوگوں کو ملتی لوگوں کے اندر اسے پڑھنے کا اشتیاق بڑھتا رہا۔ چونکہ پٹنہ کے جس علاقے کو موضوع بنایا گیا تھا، وہاں عام دنوں میں یہی صورت حال ہوا کرتی تھی۔ اس لئے پٹنہ اور آس پاس کے لوگوں کو مزید دلچسپی نظر آئی اور اس پر انجم مانپوری کا انوکھے اور پر لطف انداز بیان نے دو آتشہ کا کام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ نئے پرانے لوگوں کے ذہن میں ٹھیک ''میر کلو کی گواہی'' کی طرح ''کرایہ کی ٹمٹم'' بھی پوری طرح محفوظ ہے اور لوگ اس کی

مثالیں پیش کرتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ مزاح زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے، جس کا فنکارانہ اظہار ہوا ہو۔ اس رائے کو سامنے رکھیے اور 'کرایہ کی ٹمٹم'' میں بندھے مریل گھوڑے کا تصور کیجئے اور کمزور، ناتواں گھوڑے سے ٹمٹم پر سوار خود مانپوری اور دیگر سواریوں کی یہ توقع کہ وہ منزل تک جلد پہنچا دے۔ مانپوری کو اپنی ریل گاڑی کے چھوٹ جانے کا خوف ستا رہا تھا اور وہ ہر حال میں وقت پر اسٹیشن پہنچنا چاہتے تھے، تاکہ ٹرین چھوٹ نہ جائے۔ ایسے میں قاری کی بے اختیار مانپوری کے ساتھ نفسیاتی طور پر ہمدردی ہوتی ہے کہ کسی طرح ناتواں اور زخمی گھوڑا انھیں منزل تک پہنچا دے۔ قاری پورے انشائیہ میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ وہ ٹمٹم کے اس مختصر سفر کو اختراعی واقعہ نہیں بلکہ حقیقت پر منحصر سمجھنے لگتا ہے اور میرے خیال سے کسی بھی فنکار کے فن کی یہی بڑی کامیابی ہے۔ ''کرایہ کی ٹمٹم'' پڑھتے وقت میں خود ایسے نفسیاتی لمحوں سے گزرا، اس لئے مجھے یقین ہے کہ یہ صرف میرا ہی تجربہ نہیں بلکہ عام نفسیاتی عمل ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح کسی فلم کو دیکھنے کے درمیان ویلن کو پٹتے دیکھ کر بھی ویلن سے نہیں بلکہ پیٹنے والے ہیرو یا ہیروئن سے ہمدردی کا اظہار سنیما ہال میں بیٹھے لوگ بے اختیار چیخ چیخ کر کرنے لگتے ہیں۔

انجم مانپوری کے پہلے مجموعہ انشائیہ ''طنزیات مانپوری'' میں موجود ایک اور انشائیہ ''میونسپل الیکشن'' ایسا ہے جو اپنی طوالت کے باعث کم پڑھا گیا، لیکن جس نے بھی پڑھا، انھیں تو اندازہ ہوا ہوگا کہ یہ انشائیہ یقینی طور پر اہم انشائیوں میں قابل قدر اضافہ ہے۔ یہ انشائیہ بھی مانپوری کے اپنے رسالہ'' ندیم'' کے فروری۔ مارچ 1933ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا، جو کہ 58 صفحات پر مشتمل ہے۔ طوالت کو اگر مانپوری compact کرتے، تو اس کے حسن میں مزید اضافہ ہوتا۔ ویسے مانپوری کی اس خامی کی شکایت کئی لوگوں نے کی ہے۔ بہرحال انھوں نے 'میونسپل الیکشن'' میں پہلے تو مختلف الیکشن کی غرض و غائت بیان کی ہے۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس تفصیل میں مانپوری نے اپنے گزشتہ میونسپل الیکشن میں ہوئی کامیابی کا ذکر جس انداز سے کیا ہے، ذرا اس انداز بیان کو ملاحظہ کریں:

''یہ محض خدا کا فضل اور ورکروں کی دعا یا میونسپلٹی کے آب و دانہ کی کشش کہئے کہ بوگس ووٹروں کے دھڑم دھکے میں لڑھک کر کسی نہ کسی طرح میونسپلٹی میں جا پہنچا، اب جو وہاں پہنچ کر میونسپلٹی

کی اندرونی دنیا کو دیکھتا ہوں تو آنکھوں کے پٹ کھل گئے۔حکومت،عزت،شان،اختیارات کے علاوہ اور بھی کئی طرح کی دلچسپیوں کے سامان موجود،حکومت کا شوق ہوتو وارڈ جمعدار اور چپراسی تعمیل حکم کے لئے کمر بستہ،رعب جمانے اور شان کی نمائش کا خیال ہوتو میونسپل کلرک خوشامد اور چاپلوسی کے لئے موجود.....''

ایسے شاندار حالات کو دیکھ کر ایک بار الیکشن لڑ لینے،کامیاب ہونے اور ''حکومت'' کرنے ''شان وشوکت واختیارات'' دیکھ لینے اور اس کا مزہ چکھ لینے کے بعد ہمیشہ الیکشن لڑنے کے چسکا کو کیونکر روکا جا سکتا ہے۔یہی حال خود انجم مانپوری کا ہوا۔خیر سے وہ ایک بار میونسپل الیکشن جیت چکے تھے۔ایسے میں یہاں کے تجربات اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کرنے کے لئے ان کے پاس کافی مواد تھا۔مانپوری کے اس انشائیہ میں اتنے زیادہ طنز،ظرافت کی چاشنی کے ساتھ موجود ہیں کہ طوالت کے باوجود قاری آگے بڑھتا جاتا ہے اور محظوظ ہوتا جاتا ہے۔بات کو وہ اس طرح شروع کرتے ہیں کہ میونسپل الیکشن میں کامیابی کے بعد بھی،عام ڈگر پر چلتے ہوئے اپنے علاقے کی صاف صفائی اور عوامی ضروریات کو پوری طرح نظر انداز کیا گیا۔یہاں تک کہ عام لوگ انھیں پہچانتے تک نہیں تھے کہ انھوں نے اپنے علاقے میں لوگوں کا حال چال جاننے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔کام وہی کیا جن میں انھیں مالی فائدہ ہوتا نظر آیا۔اس سلسلے میں یہ ایک اقتباس دیکھئے،کہتے ہیں:

''اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میونسپلٹی کا اور کوئی کام ہی نہیں کرتا۔داخل خارج یا انکوائری کی رپورٹ میں کافی دلچسپیاں لیتا ہوں اور فریقین میں سے بلا وجہ کسی کی طرفداری نہیں کرتا۔جس نے دوران تحقیقات میں،مجھے مطمئن کر دیا اس کے حسب خواہ رپورٹ دینا میرے لئے لازمی ہو جاتا ہے۔رپورٹ کا موافق یا خلاف ہونا محض فریقین کی پیروی پر ہے۔اس کے علاوہ بھی کارآمد کاموں کیلئے وقت دیتا رہتا ہوں۔میونسپل کونٹریکٹوں کے ٹھیکہ دلانے میں سعی سفارش،دوڑ دھوپ میں میرا کافی وقت صرف ہوتا ہے۔اب اگر کوئی میرے قیمتی وقت سے فائدہ نہ اٹھائے تو اس میں میرا کیا قصور...''

آپ نے دیکھا کہ انجم مانپوری نے کس خوبصورتی سے بحیثیت میونسپل ممبر اپنی خامیوں،کوتاہیوں اور اپنی مفاد پرستی کو واضح کرتے ہوئے میونسپلٹی کے اندر کی پھیلی رشوت اور پیروی پر ہونے

والے کام کو اجاگر کیا ہے۔وہ خود ہی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں:

''مخالف کنڈیڈیٹ نے مجھے نااہل اور نکما مشہور کر کے غلط پروپگنڈا پھیلا رکھا ہے ایک پبلک میٹنگ کر کے اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہئے۔''

اپنی نااہلی کی صفائی کیلئے وہ ایک میٹنگ کا اہتمام کرتے ہیں،عوام سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن ہر جگہ انھیں ناکامی ہی ملتی ہے۔اس لئے کہ اپنی مدت ممبری میں انھوں نے بہت سارے کئے گئے وعدوں اور دعووں کے باوجود عوامی فلاح کا کوئی کام یا ان کی بنیادی ضرورتوں پر کبھی توجہ دی ہی نہیں۔اس لئے عوام کا ان سے مخالف ہونا فطری تھا۔عوامی میٹنگ میں وہ عوام کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں،لیکن عوام ان کی باتوں پر اعتبار نہیں کرتے اور ان کا استقبال احتجاجی نعروں سے کرتے ہیں،اس نازک موقع پر مانپوری کا یہ جملہ دیکھئے اور اس کی رنگا رنگی اور بذلہ سنجی کو شدّت سے محسوس کیجئے۔

''بھائیو:گاندھی جی کا حکم ہے کہ شانتی کے ساتھ ہلاّ کرو،اگر آپ لوگوں کے دل میں ذرا بھی وائلنس کا خیال آیا تو سمجھئے کہ سوراج کا بنا بنایا ہوائی قلعہ اکدم زمین دوز ہو کر رہ جائے گا......''

انجم مانپوری نے اپنے اس انشائیہ میں خود کی تضحیک اور تمسخر اڑا کر دراصل معاشرے کی خامیوں کو اپنے مخصوص اسلوب میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔پہلے انتخاب میں کامیاب ہو کر عوام سے دوری بنانے کے باعث عوام جس طرح ان کی بے عزتی کرتے ہیں۔طعن وتشنیع سے نوازتے ہیں،طرح طرح کی آوازیں کستے ہیں۔ان تمام باتوں کو بیان کر مانپوری اپنے ہونے والے الیکشن میں اپنی امیدواری کو اپنے ناکارہ اور نااہل بتا کر ملک کے اندر ہونے والے انتخاب میں در پردہ ہونے والے کھیل پر سے پردہ ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور ہدف ملامت بناتے ہیں۔یہ پورا منظر نامہ دراصل ملک کے اندر ہونے والے انتخابات پر سے پردہ ہٹاتا نظر آتا ہے اور مانپوری کا یہی مقصد بھی ہے۔عوامی میٹنگ،عوامی جلسوں میں،لوگوں سے گھر گھر جا کر انھیں ملنے میں رسوائی اور ذلالت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے،لیکن گالیاں کھا کر بھی بے مزہ نہیں ہو رہے ہیں کہ یہ چند دنوں کی گالیاں،رسوایاں،مخالفتیں،مزاحمت،احتجاج سب کچھ برداشت کر رہے ہیں کہ الیکشن میں جیت گئے تو پھر تو مزے ہی مزے ہیں۔اپنے کارندوں کے مشورہ پر گھر گھر گھومتے ہوئے،طرح طرح کے طنز اور لعن طعن کا سامنا

کرتے ہوئے ایک خان صاحب کے یہاں ووٹ کی درخواست لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ یہاں بھی مانپوری مضحکہ خیز صورت حال کا کس طرح پُر مزاح انداز میں سامنا کرتے ہیں، یہ دیکھئے:

'' میں: میں ووٹ کے لئے حاضر ہوا تھا۔اس وارڈ سے اب کے پھر دوبارہ.....

خان صاحب: خدا آپ پر رحم کرے۔ خیر ووٹ کے متعلق جو آپ کہتے ہیں تو پہلے ہی میرے دوست بابو گنگا رام اپنے کسی عزیز کے لئے وعدہ لے لیا ہے۔ میں انھیں زبان دے چکا ہوں۔ اس لئے معاف کیجئے۔

میں: انھیں زبان دی تو کوئی مضائقہ نہیں، مجھے ووٹ دے دیجئے۔اس میں تھوڑی بہت ،دونوں کی خاطر ہو جائے گی۔''

یہ آخری جملہ انجم کی ذہانت اور خوش طبعی کا ثبوت ہے۔ وہ کس طرح اپنے جملوں سے ٹیس بھرے ماحول کو بھی زعفران زار بناتے ہیں۔ یہ مانپوری کا ہی حصہ ہے۔ مانپوری اور ان کے کارندوں کو کس طرح نوٹ سے ووٹ خریدے جاتے ہیں، اس کا بھی بخوبی اندازہ اور تجربہ ہے۔ یہ چند جملے دیکھئے اور ظرافت کے ساتھ ہونے والے الیکشن کی بدعنوانیوں پر گہرے طنز کو محسوس کیجئے۔

''فلاں گلی کے ووٹر تو سمجھئے کہ ایسے پکے ہو گئے کہ وہاں اب کسی کو جانے کی ضرورت ہی نہیں، صرف دو دو چار چار روپئے فی ووٹر میں کام چل جائے گا۔اس کے لئے تین چار ہزار کی رقم بس کافی ہے......''

الیکشن میں امیدوار کی ایمانداری، عوامی ذمّہ داری اور عوام کی خدمات کا جذبہ کی اہمیت نہیں ہوتی، بلکہ امیدوار بے ایمان، چرب زبان اور منفی سوچ وفکر رکھنے والا ہو، لیکن گانٹھ کا پکّا ہو، ایسے لوگ اپنی دولت کے سہارے انتخاب میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ نوٹ سے ووٹ دینے والوں کی مانپوری کی نگاہ میں کیا اہمیت ہے، ذرا یہ بھی دیکھئے......

'' واللہ: آپ بھی عجیب شکی آدمی ہیں۔ یہ ورکر بے چارے تو تھوڑے سے معاوضہ میں میری خاطر دنیا بھر کا جھوٹ، فریب، عیاری، دغابازی کرنے کو تیار ہیں، اب ایسا کیا ہوگا، میرے ہی ساتھ ایسی خفیف حرکت کریں گے۔''

ان جملوں میں کس قدر طنز چھپا ہے، اسے شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ بتانے کی

ضرورت نہیں کہ الیکشن کے موقع پر روپئے، پیسے لے کر کیسی کیسی اوچھی اور گھٹیا حرکت کرنے سے بھی ایسے لوگ گریز نہیں کرتے۔طنز بھری ایسی باتوں کے درمیان مانپوری ظرافت کے بھی گل و بوٹے کھِلاتے جاتے ہیں کہ قاری کے انہماک میں کمی نہ ہو۔ ووٹنگ کے وقت لوگوں کی بڑھتی بھیڑ کو وہاں پر ڈیوٹی پر تعینات پولیس والے کس طرح قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس تکلیف دہ منظر کا ایک منظر نامہ دیکھئے، جسے اپنی فنکارانہ خوبیوں سے وہ کس طرح پُر مزاح اور پر لطف بنا دیتے ہیں:

''... پولس کی خوش نظمی دیکھ کر واقعی جی خوش ہو گیا کہ اتنے بڑے سیلاب کو صرف پانچ ڈنڈے سے پیچھے ہٹا دینا معمولی شجاعت نہیں اور سب سے زیادہ قابل داد پولس کی عدل پروری تھی کہ بلا رو رعایت شریف، رذیل، ادنیٰ، اعلیٰ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکا۔ چنانچہ اس فیض عام میں، میں بھی محروم نہیں رہا اور نان وائلنس والوں کی طرح پولس کی اس پیشکش کو سر اور آنکھوں پر لیا۔''

مانپوری کے ان جملوں میں جو حسن اور ادائیگی میں جو برجستگی اور شگفتگی کے نمونے ہیں، وہ ایک ایک لفظ سے عیاں ہیں اور پڑھنے والا ان الفاظ کے سحر میں کھوتا چلا جاتا ہے اور یہی انجم مانپوری کا فنی کمال ہے۔ روپئے، پیسے کے بدلے خریدے گئے ووٹوں اور کامیاب ہونے کے لئے ہر طرح کا حربہ مثلاً دھوکہ، فریب، جھوٹ، دغابازی کو پوری طرح بروئے کار لاتے ہوئے نیز عوام کی زبردست مخالفتوں کے باوجود الیکشن میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس کامیابی کے بعد ایسے کامیاب امیدوار کو پبلک کا صحیح نمائندہ کہا جاتا ہے۔ جو کہ سراسر دھوکہ اور فریب ہے۔ ایسے فریبی اور آنکھوں میں دھول جھونکنے والے کامیاب ہونے والے امیدواروں کے سلسلے میں مانپوری کی منفرد لیکن طنز آمیز رائے ملاحظہ کریں:

'' پولنگ بند ہونے کے وقت تک یہ خفیہ ووٹ کا سلسلہ جاری رہا اور سچ پوچھئے تو سستے داموں پہ سودا بُرا نہیں رہا۔ اب اس کے بعد بھی کامیاب ہونے پر مجھے پبلک کا صحیح نمائندہ لوگ نہ کہیں تو ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے۔ چنانچہ دوسرے روز بیلٹ بکس کھلنے کے بعد میری ہر دلعزیزی اور پبلک کی نمائندگی کا باضابطہ اعلان بھی ہو گیا۔''

انتخاب کی اتنی صاف اور واضح تصویر کشی سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مانپوری نے اپنے اس انشائیہ میں جو کچھ اتنی تفصیل سے بیان کیا ہے وہ سب کچھ سنا سنایا یا دور سے دیکھا ہوا نہیں ہے بلکہ

بہت قریب سے دیکھا اور بھوگا ہوا ہے۔ مانپوری کے بیان کردہ یہ سارے واقعات کچھ تصوراتی ہو سکتے ہیں، لیکن بیشتر ذاتی تجربات ومشاہدات کا حصہ ہیں۔ چونکہ وہ خود کئی بار الیکشن میں کھڑے ہو چکے تھے اور کامیاب بھی ہوئے تھے۔ اس لئے ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پوری رنگینی اور روانی کے ساتھ اس انشائیہ میں موجود ہیں۔ اس سلسلے مانپوری کے ایک قریبی رشتہ دار اور معروف ادیب قیوم خضر (مرحوم) انجم مانپوری پر لکھے اپنے ایک مضمون میں مانپوری کے الیکشن میں کامیاب ہونے اور ان کے مشہور انشائیہ ''میونسپل الیکشن'' کے تعلق سے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مانپوری بڑے مرنجان مرنج اور سوشل آدمی تھے۔ گیا شہر کی سوشل لائف میں ان کی شخصیت ممتاز ومنفرد تھی۔ علمی وادبی دلچسپیوں کے علاوہ سیاسی وسماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے آبائی محلّہ مانپور سے کئی بار میونسپل کمشنر منتخب ہوئے۔ جس کی بھرپور عکاسی اپنے انشائیے ''میونسپل الیکشن'' میں کر کے انھوں نے حقیقت نگاری اور اپنے مزاحیہ فن کا ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ گیا ڈسٹرکٹ بورڈ کے بھی اس وقت ممبر تھے.....''

''میونسپل الیکشن'' کے مطالعہ کے بعد مانپوری کی فنکارانہ خصوصیات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ ملک میں ہونے والے انتخاب کا نقشہ جو انھوں نے 1933ء میں پیش کیا تھا، وہی صورت حال آج بھی برقرار ہے۔ اسے کہتے ہیں فنکار کی دور بینی اور دور اندیشی، جن کا اظہار انجم مانپوری نے اپنے مخصوص انداز میں ظرافت اور طنز کی رنگارنگی کے ساتھ پیش کر کے اُس دور اور اِس دور میں ہونے والی خامیوں کو اجاگر کیا ہے۔ ایسی خصوصیات ان کے ہم عصر طنز ومزاح نگاروں میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

''طنزیات مانپوری۔ حصہ اوّل (1938ء) کے بعد ''طنزیات مانپوری (حصّہ دوئم۔1940) سامنے آتا ہے۔ جس کا مقدمہ علاّمہ جمیل مظہری نے لکھا تھا۔ ''طنزیات مانپوری'' میں شامل انشائیوں کی تعداد 12 ہے، جو 340 صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس میں شامل انشائیوں کے عنوانات اس طرح ہیں۔ (1) اپٹوڈیٹ شاعری (2) آنریری مجسٹریٹ (3) میری عید (4) تا مرد سخن نگفتہ باشد (5) ہوم پالیٹکس (6) وبال جان (7) اینٹی فادر کانفرنس (8) سخن تکیہ (9) ایک ناگہانی دوست (10) اسٹوڈنٹ لائف (11) ہوسٹل لائف (12) صاحب کا کتا۔

انجم مانپوری کی اس یادگار اور طنز وظرافت کے حسن ومعیار سے مزّین تصنیف میں مشہور اور

مقبول شاعر علاّمہ جمیل مظہری نے ''بہار جدید کا معمار۔ انجم مانپوری'' کے عنوان سے مقدمہ لکھ کر نہ صرف انجم مانپوری کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا شکوہ کیا ہے بلکہ مانپوری کے بیشتر انشائیوں کا معروضی تجزیہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ مانپوری طنز وظرافت کے میدان میں وہی مقام رکھتے ہیں، جو پطرس بخاری، شوکت تھانوی اور رشید احمد صدیقی وغیرہ کا تھا۔ مانپوری کے فنّی وفکری کمالات کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''مانپوری پر اس تبصرۂ عمومی کے بعد ہم اس کے ''طنزیات'' کی جلد دوم پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس کے ہر صفحہ پر لطافت کی روح کے ساتھ زندگی کا سرمایہ بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ پوری کتاب میں بہت کم ایسے صفحات ہیں جو ایسے چبھتے ہوئے فقروں سے خالی ہوں، جنھوں نے میری نظر کو اثنائے مطالعہ میں کچھ دیر کے لئے ٹھرائے نہ رکھا ہو۔

؎ کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست ''

جمیل مظہری نے انجم مانپوری کے دوسرے ''طنزیات'' پر اپنے مقدمہ کو کافی طول دیا ہے۔ ابتدائی کئی صفحات تمہید کے طور پر لکھے گئے ہیں، جن سے خواہ مخواہ اکتاہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ اس امر کا بذات خود انھیں بھی احساس ہوا اور وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ ''لاحول ولاقوۃ'' ہزار چاہتا ہوں کہ سنجیدگی کے ساتھ مانپوری کی طنزیات پر تنقید کروں، لیکن یہ نام ہی کچھ ایسا ہے کہ زبان پر نام آتے ہی قلم کی باچھیں کھلی جاتی ہیں اور خواہ مخواہ چھیڑ خوانی کو جی چاہنے لگتا ہے'۔ لیکن جب وہ اپنے خاص موضوع پر آتے ہیں تو ان کی تحریر کی روانی اپنی پوری فکری وفنّی کیفیات کے ساتھ نظر آتی ہے اور مانپوری کے طنزیات پر اپنی بھرپور علمی روشنی ڈالتے ہوئے وہ مانپوری کے انشائیوں کو طنزیہ ومزاحیہ ادب میں اعلیٰ مقام کا حامل قرار دیتے ہیں اور اعلیٰ مقام دینے میں اپنی دوستی کی بجائے مانپوری کے انشائیہ کو پوری طرح فن کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، پھر اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ انجم مانپوری کے انشائیوں کے تعلق سے اپنے مطالعہ کی روشنی میں اس انداز سے تمہیدی جملے جمیل مظہری نے لکھا ہے.......

''ہمارا ادب اگر چہ ابھی گھٹنوں چل رہا ہے لیکن ان چند سالوں کے اندر بہت سے مزاحیہ نویس ہندوستان کے مختلف گوشوں میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ ان میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔ بھانڈ بھی ہیں اور سنجیدہ بھی۔ کوئی صرف مسکرانے پر قناعت کرتا ہے کوئی بے ضرورت قہقہہ

لگا تا ہے کوئی خود بنتا ہے کوئی دوسروں کو بنا تا ہے کوئی چٹکیاں لیتا ہے کوئی گدگدیوں پر اتر آتا ہے کوئی ہنسی ہنسی میں ہنسنے والوں کو آئینہ دکھلا دیتا ہے کہ وہ دیکھ لیں کہ ہنستے وقت ان کی صورت کتنی بھیانک اور قبیح ہوجاتی ہے۔انہیں ہنسنے ہنسانے والے دوستوں میں ہمارے بھائی مانپوری بھی ہیں جن کی ظرافت جملہ مذکورہ بالا کیفیتوں کا مجموعہ ہے۔یعنی یہ کہ سنجیدگی کے ساتھ مسکراتے بھی ہیں اور طراری کے ساتھ قہقہے بھی لگاتے ہیں گدگداتے بھی ہیں اور ہنسی ہنسی میں چٹکی بھی کاٹ لیتے ہیں ہشیاری بھی دکھاتے ہیں اور ضرورت کے وقت بیوقوف بھی بن جاتے ہیں لیکن جو چیز کہ ان کو ان کے اکثر ہم جنسوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک مقصد ہر حال میں ان کے پیش نظر رہتا ہے گو ان کی مقصد پرستی ان کی تحریر سے کھلنے نہیں پاتی۔کیونکہ اس کا کھل جانا مزاحیہ نویسی کا ایک بدنما نقص ہے۔تاہم ان کے مضامین نے تفصیلی مطالعہ کرنے ان کے دل کی گہرائیوں کی تھاہ لینے والوں سے ان کی طبیعت کا یہ چور چھپ نہیں سکتا کہ ان کے قہقہے قہقہے نہیں بلکہ کراہ ہیں،اس درد کی،اس ٹیس کی جو ایک شخص کے دل میں اپنے سماج کو نفسیاتی اور اخلاقی کمزوریوں میں مبتلا دیکھ کر اٹھتی رہتی ہے،اپنی معاشرت کی اصلاح کے لئے انہوں نے لیڈری کی جگہ مزاحیہ نویسی کو آلۂ کار بنایا اور اس آلہ کار کا انتخاب ان کے حسن مذاق کی ایک اور دلیل ہے کیونکہ آدمی اپنے عیوب کو مذاق کے پیرایہ میں سُن کر کھسیا تو ضرور جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ اپنے اوپر تنقیدی نظر بھی ڈالتا ہے اور اپنی جگہ ان عیوب کو دور کرنے کی خاموش کوشش کرتا رہتا ہے تا کہ پھر کہیں اس کا مضحکہ نہ اڑایا جائے۔برخلاف اس کے اگر اس کے نقائص کو نصائح کی تلخی اور وعظ و پند کی ترشی کے ساتھ بیان کیا جائے تو غصہ کے ساتھ اس کی خودی میں ایک شدت آجاتی ہے جس کا نفسیاتی نتیجہ ہٹ دھرمی ہوتا ہے۔غصہ میں یوں بھی انسان کی نگاہ تنقیدی نہیں رہتی کہ وہ اپنے عیوب کو سمجھ سکے۔ان کی اصلاح کا سوال تو بہت دور ہے۔یہی وجہ ہے کہ علماء کا گروہ عموماً مقصد میں ناکام رہتا ہے اور مزاحیہ نویس ہنسی ہنسی میں وہ کچھ کر جاتا ہے جو واعظین کو محراب ومنبر کی بلندی سے بھی میسر نہیں۔اس کا تاریخی ثبوت یہ ہے کہ وہ ممالک جن کا ستارہ اقبال آج ارتقائی چوٹیوں سے جھانک رہا ہے۔ان کی رفتار ارتقاء کو تیز تر کرنے اور ان کے اخلاقی اور معاشرتی رجحانات کو سدھارنے میں ان کے مزاحیہ نویسوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔آج مانپوری بھی انہیں کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔وہ اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہوا۔اس کا احاطہ ابھی ممکن نہیں۔اصلاحی

کوششوں کا نتیجہ حالات کی رفتار کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے اور حالات کی رفتار ایک صدی سے پہلے کسی تحریک کے متعلق اپنے فیصلہ کا اعلان نہیں کرتی۔"

علامہ جمیل مظہری کی نظر "طنزیات" حصہ دوئم پر مقدمہ لکھتے وقت بے اختیار مانپوری کے پہلے انشائیے "اپٹوڈیٹ شاعری" پر ٹکتی ہے اور وہ اس انشائیہ کا بہت تفصیل سے جائزہ پیش کرتے ہیں ۔اس جائزہ میں وہ اعتراف کرتے ہیں کہ:

"بہرحال اپٹوڈیٹ شاعری میں انہوں نے خاص اپنی شاعری کے جو نمونے پیش کئے ہیں وہ ڈنکے کی چوٹ پر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مانپوری نے اگر نثر کے ساتھ نظم کو بھی اپنی شاعری کا آلہ بنایا ہوتا تو اکبرالہ آبادی مرحوم کی خلافت کا مسئلہ بغیر کسی نزاع کے ان کے ہاتھ پر طے ہوجاتا ہے۔آپ ملاحظہ فرمائیں۔

سائے کا دامن تھا اونچا دل میں حسرت رہ گئی
صرف ٹانگوں سے لپٹ کر خاک تربت رہ گئی
کورٹ شپ کے بعد پہلو گرم ہوگا یانہیں
یہ پروبشنز کبھی کنفرم ہوگا یانہیں
عاشق ہوں ایک نرس کے حسن و جمال کا
کہتے ہیں سب مریض مجھے ہسپتال کا

اس آخری شعر کی خلش گوئی ہمارے عظیم آباد کے نوجوان طلباء سے پوچھئے۔منظر کشی میں بھی مانپوری اپنے رنگ کے اچھوتے ہیں چنانچہ سر راہ ان کی دیہات کی صبح کا دلچسپ منظر ملاحظہ ہو:

گوبر کی بھینی بھینی سی خوشبو کی وہ لپک
گوبر کا ڈھیر گڈھے کے پانی کی وہ مہک
ہوتے ہی صبح نکلا ہر اک گھر سے بے دھڑک
وہ سلسلہ گرہست کا بستی سے کھیت تک
رُخ ہے کسی گرہست کا کھلیان کی طرف
لوٹا لئے چلا کوئی میدان کی طرف

یوں تواس قسم کے تمام نمونے شاعری کے موجودہ میلانات پر چبھتی ہوئی تنقیدیں ہیں۔لیکن ان کی نظم معرّا اورنظم منثورسن کرتو بے اختیار مانپوری زندہ باد کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ادب لطیف کے نام سے جوخرافات آج کل کے رسالوں میں نکل رہے ہیں ان پراس سے بہتر طنزمیری نظر سے نہیں گزرا۔حالانکہ وہ تمام بہترین مضامین اور بہترین نظمیں میرے پیش نظر ہیں جو ممتاز حسین عثمانی مرحوم کے ادبی جہاد کے سلسلہ میں اودھ پنچ کی زینت بنتی رہی ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ مانپوری نے اپنے زمانے میں کی جانے والی اپٹوڈیٹ شاعری کے نام پر جس طرح کی شاعری کے نمونے پیش کئے ہیں،اس نے اردوشاعری کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔جس پرانجم مانپوری نے زبردست مذاق اڑاتے ہوئے طنز کیا ہے۔

''طنزیات' کا دوسراانشائیہ''آنریری مجسٹریٹ'' ہے جوکہ ان کے رسالہ''ندیم''میں اگست 1932 کے شمارہ کی زینت بنا تھا۔اس انشائیہ میں انجم مانپوری نے خودکوایک کردار میں ڈھال کرخود کی جس طرح تضحیک کرتے ہوئے اورتمسخراڑاتے ہوئے اس انشائیہ کواعلیٰ معیار کا انشائیہ بنایا ہے یہ صرف مانپوری کے ہی فن کا کمال ہے۔اس انشائیہ میں ابتدائی صفحات پر ہرطرح کے مجسٹریٹ کا اپنے خاص انداز میں تعارف کرایا ہے۔اس تعارف میں بھی طنز اورظرافت کے نئے نئے انداز بلکہ میٹھے اور تیکھے انداز کواپنا کراس پورے انشائیہ کومجسٹریٹ کے حوالے سے اس طرح یادگاراورتاریخی بنادیا ہے کہ جب کبھی کسی مجسٹریٹ کے کچھ فیصلے یا ان کے مجسٹریٹ بننے کی بات ہوتی ہے،بے اختیار اس انشائیہ کی یاد آجاتی ہے۔''آنریری مجسٹریٹ'' بننے کے لئے کیسے کیسے جتن کئے جاتے ہیں۔ان کی بھی تفصیل بیان کر مانپوری نے ایسے مجسٹریٹ بننے والوں کی نقاب کشائی کی ہے۔اس تناظر میں مانپوری نے اپنے آنریری مجسٹریٹ بننے کی جو''خوبیاں'' بیان کی ہے وہ نہ صرف ہنسنے پراور پھر ہنستے ہنستے طنز کے چبھن کوبھی بڑی شدت سے محسوس کرنے پر مجبور کرتا ہے۔یہ چند جملے دیکھئے اورلطف اٹھائیے:

''خدا کا لاکھ لاکھ کا شکراورکلکٹر صاحب کا ہزار ہزاراحسان کہ ہم جیسے خاکسار،ذرّہ بے مقدار،گناہ گار،سیاہ کار،بداطوار و بدکردار کواتنا بڑا درجہ عطا فرما کر صاحب اختیار والا اقتدار بنا دیا ......''

انجم مانپوری بننے کوتو آنریری مجسٹریٹ بن گئے،لیکن اس''ہائی پوزیشن'' پانے کے لئے کس قدر ذلّت ورسوائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔اسے بیان کرتے ہوئے اپنے طنز بھرے فقروں سے جس طرح تیراندازی کی ہے۔وہ ایک باوقار اور حساس انسان کو زخمی کئے جانے کے لئے کافی ہے۔ مانپوری کی عزت وآبرو کا جنازہ نکلتے ہوئے دیکھئے اوران کی ہمّت اورحوصلے کی داد دیجئے:

''حسب معمول ایک روز سلام بجا آوری کی ڈیوٹی ادا کرنے کے لئے کوٹھی پر حاضر ہوئے،اب ہمیں کیا معلوم کہ میم صاحب نے ڈانٹ بتائی ہے اور صاحب اس وقت عتاب زدہ ہو رہے ہیں۔ہم نے جیوں ہی کوٹھی کے سائبان میں قدم رکھا۔نظر پڑتے ہی صاحب نے غرّا کر چپراسی کو بلایا اور خدا جانے اس سے کیا کہا کہ غریب کوہمیں کوٹھی کے احاطے کے باہر تک عزت وآبرو کے ساتھ پہنچانا پڑا۔چپراسیوں کوانعام دیتے رہنے کا فائدہ اس روز معلوم ہوا.....''

عزت آبرو کے ساتھ کلکٹر صاحب کی کوٹھی سے باہر نکالے جانے کا بیان زیرلب مسکراہٹ پر ہی مبنی نہیں،بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے۔لیکن بقول مانپوری''اعزازی عہدہ کے حصول میں اکثر اس طرح کے ہمت شکن حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں'' کے مصداق پرعمل کرتے رہتے ہیں وہ اپنی مہم پر مسلسل منہمک رہتے ہیں اورآخرکار وہ کامیاب ہو ہی جاتے ہیں اور کامیاب ہوکراپنی جہالت اور بدعقلی کا مظاہرہ کو دکھا کر مانپوری آنریری مجسٹریٹ کا خوب خوب مضحکہ اڑاتے ہیں۔یہ مضحکہ وہ یونہی نہیں اڑاتے بلکہ ان کے مشاہدے میں ضرور ایسے مجسٹریٹ آئے ہوں گے،جوان کے ہدف بنے۔ایسے مجسٹریٹ کس طرح کے فیصلے کیا کرتے تھے۔اس پر انھوں نے بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ایک اعتراف یہ بھی دیکھئے:

''....یوں کسی نے ہمارے اجلاس سے مقدمہ جیتنے کی خوشی میں فیصلہ سے قبل ہی محض دوستانہ پیشگی مٹھائی کھلا دی یا نقدی دعوت کردی تو اخلاقاً اس کوقبول ہی کرنا پڑتا ہے......''

یہ انشائیہ اپنے خوبصورت اور منفرد انداز بیان سے شروع سے آخر تک اپنی برجستگی،شگفتگی اورخوش طبعی سے قارئین کی دلچسپی اورانہاک برقرار رکھنے میں کامیاب ہے۔ ساتھ ساتھ پڑھتے وقت قارئین الفاظ کے نت نئے انداز سے کبھی ظرافت،گدگدی اور کبھی طنز کی چبھن کومحسوس کرتے جاتے ہیں۔اعلیٰ اورمعیاری انشائیوں کی فہرست میں مانپوری کے ایک اورانشائیہ''میری عید'' کی بے

اختیار یاد آتی ہے۔جس میں شروع سے آخر تک مانپوری کا فن،ان کے بعض تجربات اور مشاہدات کے ساتھ سامنے آتا جاتا ہے اور پڑھنے والا لوٹ پوٹ ہوتا جاتا ہے اور کبھی کبھی طنز کے وار سے دل میں ایک خاص قسم کی کیفیت اور چبھن کو بھی محسوس کرتا ہے۔

''میری عید'' جنوری 1934ء کے ''ندیم'' میں شائع ہونے والا انشائیہ بھی انجم مانپوری کے بہترین اور یادگار انشائیوں میں ایک ہے۔اس انشائیہ کی یہ خوبی ہی ہے کہ اسے بار بار پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے اور ہر بار وہی دلچسپی اور انہماک برقرار رہتا ہے۔اس انشائیہ میں مانپوری کی جو برجستگی اور شگفتگی ہے وہ پڑھنے والے کو ایسی ہنسی اور قہقہے لگانے پر مجبور کرتا ہے کہ قریب بیٹھے شخص کو اگر یہ معلوم نہ ہو کہ یہ شخص مانپوری کا کوئی انشائیہ پڑھ رہا ہے تو اسے پڑھنے والے کے دماغی خلل کا شبہ ہو جائے۔اس انشائیہ کا نام تو 'میری عید' ہے لیکن بات رمضان سے شروع ہوتی ہے۔ایسے لوگ خاص طور پر ''خادم قوم'' جیسے لوگ جو رمضان میں روزے بلا کسی عذر کے نہیں رکھتے ہیں،لیکن سماج میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ روزے کا پورا احترام کر رہے ہیں۔دراصل ایسے بے روزہ داروں جو بغیر روزہ رکھے روزہ دار بنے رہتے ہیں اور عید کے اہتمام میں اس طرح مصروف رہتے ہیں،جیسے پورے ماہ کے روزہ رکھنے کے بعد شکرانے کا اہتمام میں لگے ہوئے ہیں۔یہ ایک اقتباس ملاحظہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ اس انشائیہ میں مانپوری نے کیسی کیسی گل افشانی کی ہے:

''آپ سمجھ سکتے ہیں کہ رمضان میرے لئے کس قدر مصیبت انگیز ثابت ہوسکتا ہے۔بغیر روزہ کے روزہ دار بن کر جن جن مصیبتوں اور پریشانیوں کا مقابلہ مجھے کرنا پڑا۔کیا کھا کر کوئی روزہ دار کریگا۔آپ یقین مانئے کہ رمضان کے پورے مہینے میں دن کو کبھی اطمینان وسکون سے پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا۔۔۔''

اس تناظر میں مانپوری نے دن میں اپنے کھانے،پینے اور چائے نوشی کے قصے کو جس فنکارانہ اور اپنے منفرد اسلوب میں بیان کیا ہے وہ بس پڑھنے اور لوٹ پوٹ ہونے کے لئے کافی ہے۔صبح کا ناشتہ کر رہے تھے کہ اپنے ایک دوست کی نگاہوں سے پکڑے گئے۔اس پکڑ کا ذرا جواب سنئے اور مانپوری کی ذہانت کو داد دیجئے،لکھتے ہیں:

''بے موقع دھرے جانے کے باعث میں تو خود کھسیانہ سا ہو رہا تھا اس پر میاں رشید کی

چھیڑ۔کیوں حضرت:یہ کیا حرکت تھی؟ میں نے خفت آمیز تبسم کے ساتھ کہا آخر شب میں آنکھ کھلی نہیں،سحری قضا ہوگئی تھی اسی کو پورا کر رہا ہوں۔۔۔''

مانپوری کی ذہانت اور ان کے فن کا کمال ہے کہ وہ اپنے انداز بیان اور چبھتے ہوئے فقروں سے اس طرح مسحور کر دیتے ہیں کہ قاری بے اختیار بیان کئے گئے منظر میں سیدھے اترتا چلا جاتا ہے۔مانپوری،رمضان کی ایک صبح گرم گرم چائے نوش فرما رہے ہیں کہ اچانک ان کے ایک دوست آدھمکے۔اس سچوئشن میں وہ پوری گرم گرم چائے اپنے حلق میں انڈیل لیتے ہیں۔اس دلچسپ منظر کا جس انداز سے مانپوری نے نقشہ کھینچا ہے۔اسے پڑھنے کے بعد دیر تک بلکہ بہت دیر تک پڑھنے والا ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔''قوم کا لیڈر'' ہونے کی وجہ کر مانپوری کو اکثر دعوت افطار میں مدعو کیا جاتا ہے۔ان کے ایک قریبی دوست نے جب ان سے پاز پرس کی کہ روزہ تو رکھتے نہیں،پھر دعوت افطار میں کیوں شریک ہوتے ہیں۔اس سوال کا جواب سنئے''اوّل تو دعوت قبول کرنا سنت ہے،دوسرے کیا تم نے ایک دم کافر ہی سمجھ لیا ہے کہ ایک تو روزہ نہیں رکھتا،اس کے بعد افطار کے ثواب کا بھی منکر ہو جاؤں؟'' پورے رمضان کے بعد عید کی نماز،بیگم کی ضد پر اپنے ننھے میاں کو ساتھ لانے،نماز کے دوران اس کی چیخ چیخ کر رونے پر نماز میں خلل پڑنے کی شکایت اور لوگوں کی خفگی پر ان کا یہ کہنا کہ ''اس قصہ کو جانے بھی دیجئے نادان بچہ تھا عید میں غلطی سے مسجد دیکھنے چلا آیا۔مجھے بھی کبھی آپ نے عید کے سوا یہاں دیکھا ہے'' بظاہر یہ عام سا جملہ ہے جو زیر لب مسکرانے پر مجبور کرتا ہے،لیکن درحقیقت مانپوری نے خود کا تمسخر اڑا کر ان لوگوں پر زبردست طنز کے وار کر جاتے ہیں،جو بس عید اور عیدالاضحیٰ کی نماز میں شامل ہوتے ہیں،بقیہ دن نماز سے کوسوں کی دوری بنا کر رکھتے ہیں۔بہر حال حالت نماز میں ان کے جوتے کے گم ہو جانے پر کسی دوسرے کے پرانے جوتے کو پہن کر مسجد سے نکلتے ہیں اور پکڑے جاتے ہیں۔اس کا منظر بھی بڑا دلچسپ اور مزاح سے بھرپور ہے،کسی کسی طرح وہ گھر پہنچتے ہیں،یہ پورا منظر نامہ اس طرح مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے کہ بے اختیار مانپوری کے اس فنّی نمونے پر واہ نکل جاتی ہے۔اس انشائیہ میں گرچہ مزاح کا عنصر غالب ہے اور طنز کی چبھن کم ہے،پھر بھی اپنے مزاحیہ انداز بیان سے پورا انشائیہ اعلی اور دلچسپ انشائیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔اس انشائیہ میں بھی طوالت کا احساس ہوتا ہے۔اس انشائیہ کو اگر مانپوری دو حصوں ''میرا روزہ'' اور ''میری عید'' میں منقسم کر دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔

ایسا ہی ایک اور شاندار انشائیہ 'طنزیات مانپوری' حصّہ دوم میں موجود ہے۔ جس کا عنوان ہے ''صاحب کا کتّا''۔اس انشائیہ نے بھی اشاعت کے بعد خوب دھوم مچائی تھی۔ اس انشائیہ کی مقبولیت کے بعد کئی طنز ومزاح نگاروں نے ایسے ملتے جلتے عنوان سے لکھنے کی کوشش کی ضرور، لیکن مانپوری کے فن کے کمال نے جو کمال دکھایا، اس مقام تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ ''صاحب کا کتّا'' دراصل ان لوگوں پر زبردست طنز ہے جو اپنے مفادات کے لئے انتظامیہ اور افسران کے گرد چکّر لگاتے رہتے ہیں، ذلیل وخوار ہوتے ہیں، لیکن سماج میں یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ میری شخصیت کی یہ اہمیت ہے کہ میری رسائی بڑے افسران تک ہے۔اس خودنمائی کے لئے انھیں صاحب کے چپراسی، خانساماں کے ساتھ ساتھ ان کے کتّے تک کی ناز برداری کرنا پڑتی ہے۔اس موضوع کو مانپوری نے جس خوش اسلوبی سے نبھایا ہے، یہ مانپوری کے ہی فن کا کمال ہے۔اس انشائیہ میں وہ صاحب کے خونخوار کتّے سے خوف زدہ رہنے کے باوجود اسے بھی اپنا بنا لیتے ہیں۔ صاحب کی کوٹھی پر جس طرح صاحب کا کتّا ان پر بھونکتا ہے، انھیں کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے اور چپراسی کی مدد سے وہ کتے کے ستم سے بچ جاتے ہیں، لیکن صاحب کے بلاوے پر وہ اس قدر بدحواس ہو جاتے ہیں کہ صاحب کے کمرے کے دروازے پر آرام فرما رہے کتّے کی دُم کو جلد بازی میں روندتے ہوئے صاحب کے کمرہ میں جانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کے بعد ان کا جو حشر ہوتا ہے، اسے جس طرح مانپوری نے بیان کیا ہے۔اسے پڑھ کر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا ہے۔ پھر کس طرح ان کی گلوخلاصی ہوتی ہے۔اس پورے دلچسپ منظر نامہ پر بے اختیار مانپوری کی ذہانت کو داد دینے کو دل چاہتا ہے ۔طنز ومزاح سے بھرپور اس انشائیہ میں مانپوری، طنز اور ظرافت کے جو نمونے دکھائے ہیں خاص طور پر طنز کے تیر جس طرح اپنی ترکش سے نکال کر وار کرتے ہیں، وہ تلملانے کے لئے کافی ہے۔شہر میں اذان اور ناقوس کی صدائیں بیک وقت ٹکرا کر دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان کشیدگی پیدا کر دیتی ہے۔ ''چھوٹے بھائی کو یہ شکایت کہ بڑے بھائی رواداری کا ہم سے برتاؤ نہیں کرتے اور بڑے بھائی کا یہ الزام کہ چھوٹا ہو کر میری برابری کا دعویٰ کرتا ہے.....'' کشیدگی بڑھتی گئی تو آپس میں یہ طے ہوا کہ دونوں مذاہب کے لوگوں کا ایک وفد صاحب سے ملنے جائے گا اور دونوں اپنی اپنی شکایات رکھیں گے اور صاحب جو فیصلہ کریں گے، وہ قابل قبول ہوگا۔ بڑے بھائی کے تین اور چھوٹے بھائی

کے دو یعنی پانچ افراد پر مشتمل وفد صاحب سے ملنے جاتا ہے۔کوٹھی میں داخل ہوتے ہی صاحب کا کتا ٹومی بھونکنا شروع کر دیتا ہے۔اس منظر کے ساتھ ساتھ جو کلمات کی ادائیگی ہوتی ہے، اسے دیکھئے اور طنز کی چبھن کو محسوس کیجئے:

''پنڈت مہابیر پرشاد نے جو بڑے بھائی کے لیڈر تھے، ٹومی کی مخاطبت میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے طنزاً کہا۔

کیوں جناب، یہ کتا ڈانٹ کر آپکو کیا کہہ رہا ہے۔

میں نے کہا، پنڈت جی یہ کہہ رہا ہے کہ سگ باش برادر خورد مباش۔ یہ سنکر پنڈت جی چپ ہی تو گئے۔''

طنز کی چبھن کو اس ایک جملے میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جب وفد کی بات صاحب سے شروع ہونے لگتی ہے اور صاحب نے پوری بات سننے کے بعد کہی، وہ ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور روایت کے برخلاف تھا۔

''صاحب نے ناصحانہ انداز میں فرمایا۔'' بہت ہی افسوس کا بات ہے کہ آپ لوگ ملکی بھائی ہوکر آپس ہی میں لڑائی کرتا ہے''

اس ایک جملے میں مانپوری نے آپسی اتحاد واتفاق کو توڑنے اور نفاق پیدا کرنے والوں پر کس قدر زبردست وار کیا ہے، اسے شدت سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔

''طنزیات مانپوری'' حصہ دوم میں بھی شامل بارہ عدد انشائیے ایسے ہیں جو انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔جس نے ایک بار ان انشائیوں کو پڑھ لیا، وہ کبھی بھی اس میں بیان کئے گئے قصوں، کرداروں اور فقروں کی دلفریبی کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا ہے۔

انجم مانپوری کے انشائیوں کا تیسرا مجموعہ ''مطائبات'' کے نام سے 1952ء میں شائع ہوا تھا۔اس کا مقدمہ خود انجم مانپوری نے اپنے مخصوص اسلوب میں لکھا تھا اور اپنی اس تصنیف کو اپنے دوست اور بہار کی معروف سیاسی شخصیت ڈاکٹر سید محمود کے نام معنون کیا ہے۔اسے شاد بک ڈپو، مہندرو، پٹنہ۔۶ نے شائع کیا تھا۔انجم مانپوری کے اس تیسرے مجموعہ میں شامل انشائیے کی تعداد 9 ہے جو کہ 226 صفحات پر مشتمل ہے۔ان 9 عدد انشائیوں کے عنوانات اس طرح ہیں (1) کلکتہ

ریٹرنڈ (2) میری لیڈری (3) میری پہلی اسپیچ (4) دوستی (5) میرا سفر (6) انڈر گریجویٹ (7) ٹیوشن (8) سفارش (9) ہمارے داروغہ جی۔

اسی سال یعنی 1952ء میں ہی ’’طنزیات مانپوری‘‘ (حصہ اوّل) کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا تھا۔ جس کا ہندی ایڈیشن ’’نورتن‘‘ کے نام سے بھی سامنے آیا تھا۔

مانپوری کے تیسرے انشائیوں کے مجموعہ ’’مطائبات‘‘ میں شامل 9 انشائیوں میں ایسے کئی انشائیے ہیں، جو اپنے منفرد اسلوب اور فنی اظہار نیز روزمرہ کے تجربات ومشاہدات کے باعث اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ جس قدر ’’طنزیات مانپوری‘‘ کے اوّل اور دوئم مجموعۂ انشائیوں نے دھوم مچائی تھی اور ہر خاص وعام کی زبان پر مانپوری کے یہ انشائیے رہے، وہ شہرت اور مقبولیت ’’مطائبات‘‘ تک آتے آتے کچھ ماند پڑ گئے تھے۔ جس کی اہم وجہ میرے خیال میں ان انشائیوں کی طوالت ہے۔ ’مطائبات‘ میں شامل تقریباً تمام انشائیے بے جا طوالت کے شکار ہیں، اس حد تک کہ بعض اوقات قاری پڑھتے پڑھتے اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔ پھر بھی مانپوری نے اپنے ان انشائیوں میں اپنے خاص اسلوب اور مخصوص انداز بیان سے طنز وظرافت کے گہرے نقوش مرتسم کئے ہیں۔ ’مطائبات‘ پر ان کا لکھا مقدمہ بھی خاصہ دلچسپ ہے۔

اس مقدمہ پر ہم ایک نظر ڈالیں، تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ مانپوری نے اپنے انشائیوں کے تعلق سے جو اسلوب اپنایا تھا اور اپنی ہر بات طنز وظرافت کے پیرائے میں کہنے کا ان کا جو خاص انداز تھا۔ اسی انداز اور اسلوب میں اپنی اس تصنیف ’’مطائبات‘‘ کے مقدمہ میں پیش کرتے ہوئے اسے اتنا خوبصورت، دلچسپ اور بامعنی بنا دیا ہے کہ اس میں بھی انشائیے کا لطف پوری طرح سمو گیا ہے۔ اس مقدمہ میں مانپوری نے اپنے مطالعات، مشاہدات اور تجربات کے جو نمونے پیش کئے ہیں، وہ نہ صرف حیران کر دینے والے ہیں بلکہ معلومات میں اضافہ کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ اپنے اس مقدمہ میں مانپوری اپنا اور اپنے انشائیوں کا تمسخر اڑانے سے بھی باز نہیں آئے۔ دوستوں کے درمیان ’مطائبات‘ کی اشاعت کی تجویز رکھی گئی تو دوستوں نے کتاب کے مقدمہ کا سوال اٹھایا۔ اس بابت مانپوری اپنی حماقتوں کے ڈونگرے خود پر ہی برساتے ہوئے اپنی ذہانت اور بذلہ سنجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ کُل باتیں تو خیر طے ہوچکیں، لیکن اس کے مقدمہ کے لئے آپ نے کس کو تیار کیا ہے۔

اس دھر پکڑ کے زمانہ میں جب کہ بات بات پر مقدمہ چل جانیکا خوف آدمی کو بدحواس کئے رہتا ہے۔ مقدمہ کا نام سنکر میں کیا ہر بھلا آدمی علی قدر رافتادطبیعت اختلاج قلبی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے میں نے کہا:

بھائی صاحب: میری اس کتاب کو مقدمہ سے کیا سروکار۔ فاسسٹ، کمونسٹ، سوشلسٹ قسم کی لسٹ میں میرا نام نہیں اور اس کتاب میں پریس ایکٹ، ڈیفنس ایکٹ، سیفٹی ریزرا یکٹ کی زد میں آنے والی کوئی بات ہے۔ پھر مقدمہ کا کیا بے جوڑ ذکر آپ نے چھیڑ دیا۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کہ کتاب کے مقدمہ میں تشویش کی کونسی بات ہے؟ مقدمہ کی وجہ سے کتابوں کی شہرت میں اور چار چاند لگ جاتے ہیں۔ میں نے کہا حضرت یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ اخباروں میں کتابوں کے مقدموں کی سنسنی خیز روداد موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ مسلسل شائع ہونے کے بعد پبلک میں اس کتاب کے مطالعہ کا اشتیاق بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے مقدمہ کی بدولت کتاب کی شہرت اور مقبولیت سے مجھے انکار نہیں۔ مگر معاف کیجئے ایسی شہرت اور نیک نامی سے جو مقدمہ کی بدولت سزا کے ساتھ ہو، خاکسار جیل کی اے کلاس کے لذیز کھانوں سے عزّت وآبرو کے ساتھ اپنے گھر کی دال روٹی کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ جناب میں باز آیا کتاب کے چھپوانے سے۔ یہ بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ مقدمہ کے جھنجھٹ میں کون پھنسے۔ اتنا سننا تھا کہ یاروں نے قہقہے لگا کر مجھے بتانا شروع کر دیا۔

ایک صاحب: واقعی مزاح نگار ہونا اور بات ہے اور سمجھدار ہونا اور شئے ہے.......‘‘

(مطائبات: صفحہ: 3-2)

مانپوری اس اقتباس میں اپنی کتاب پر مقدمہ کے سلسلے میں بڑے دلچسپ انداز میں اپنا تمسخر اڑاتے ہوئے ان مصنفوں پر طنز کے وار کرتے ہیں، جو دوستانہ، خوشامدانہ بلکہ کبھی کبھی نذرانہ کے ذریعہ اپنی کتاب کی مبالغہ آمیز خوبیوں اور مصنف کی علمی لیاقت کی تعریف لکھا کر کتاب کی اہمیت کا سکّہ لوگوں پر بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

’’اپنا مقدمہ آپ ہی کیوں نہ لکھ ڈالوں: یہ خیال لئے ہوئے گھر پہنچا اور یہ سوچنے لگا کہ اور دوسرے مصنفین مشہور ادیبوں سے دوستانہ یا خوشامدانہ یا نذرانہ کے ذریعہ اپنے کتاب کی مبالغہ آمیز

خوبیاں اور مصنف کے تجربہ علمی اور قابلیت کی تعریف لکھا کر کتاب کی اہمیت کا سکّہ لوگوں پر بٹھا دئے ہیں مگر میرے لئے اپنے قلم سے اپنی اور اپنے کتاب کی تعریف لکھنا اپنے منہ آپ میاں مٹھو بننا کہاں تک مناسب ہوگا؟

(مطائبات:صفحہ:4)

مانپوری آخر کار سپر ڈال دیتے ہیں اور اپنی کتاب کا مقدمہ بقلم خاص کے لئے تیار ہوجاتے ہیں ۔ اپنی کتاب کے مقدمہ کے لئے وہ وہی پیٹرن اپناتے ہیں ، جو کورٹ کچہری میں مقدمہ دائر کرتے وقت کئے جاتے تھے۔ یہ انداز بیان دیکھئے اور نہ صرف مقدمہ 'مطائبات' سے محظوظ ہوں بلکہ مانپوری کے ذریعہ بیان کئے گئے خود کے تعارف اور تعریف کا لطف لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں:

''.... چونکہ مقدمہ کے لئے ترتیب مشعل بھی ضروری ہے۔ اس لئے پہلے خاکسار مصنف کا تعارف جسکو مقدمہ کے اصطلاح میں IDENTIFICATION آئی ڈنٹی فیکیشن یا شناخت بھی کہتے ہیں حسب ذیل ہے۔

مقدمہ نمبر ۳ زیر دفعہ تالیف وتصنیف بابت مطائبات ''

نام مصنف:۔ خادم المصنفین کمترین محمد مانپوری الدین احمد عفی اللہ عنہ

سکونت: سکونت سابق مانپور حال مقام گیا۔ آئندہ قیام ودوام دار البقا۔۔۔۔

عمر : طبعی کے لگ بھگ۔

حلیہ و دیگر خصوصیات: افسردہ صورت، شگفتہ طبعیت، چہرہ سے نمایاں متانت، گفتگو میں سنجیدہ ظرافت:۔

پیشہ: سابق پیشہ زمینداری و قدرے کاشتکاری، موجودہ مشغلہ صرف ادائے مالگزاری، کچہری کی بستہ برداری، وکلا اور عملوں کی ناز برداری اور گاہے گاہے مضمون نگاری۔

حیثیت:۔ مالی حیثیت تو بقول خود مصنف مہاجنوں کے سوا خدا کے فضل سے اور کسی کے ایک پیسہ کا دیندار نہیں۔ باقی رہی علمی حیثیت تو آپ اسی سے قابلیت وصلاحیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مختلف زبانوں کی اہم اور مشہور کتابوں سے بچپن ہی میں فارغ التحصیل ہوجانا کوئی معمولی بات نہیں۔ عربی زبان میں دنیا کی سب سے اہم اور مقدس کتاب ''الفرقان'' جس میں سارے جہان کے

علمی خزانے ہیں، صرف دس سال کی عمر میں ختم کردینا اور اسی کے ساتھ فارسی زبان میں حضرت سعدی کی مشہور اور مقبول کتاب ''کریما'' اسی کمسنی کے زمانے میں پڑھ لینا کیا معمولی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ انگریزی زبان کا شائد ہی کوئی ایسا بدنصیب اخبار ہو جسکی عبارت پڑھنے میں بلا لحاظِ تلفظ کوئی رکاوٹ محسوس ہوتی ہو۔ انگریزی خوانی خداداد صلاحیت نہیں تو اور کیا ہے۔''

(مطائبات، صفحہ:8-7)

''مطائبات'' میں مانپوری نے اپنے لکھے مقدمہ میں ایسی ایسی اصطلاحیں پیدا کی ہیں اور ادب کے مختلف اصناف کی تعریف وتشریح کی ہے کہ بس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا غضب کی اپنی ادبی صلاحیتوں کا طنزیہ وظریفانہ انداز میں اظہار کیا ہے۔ ادب شریف، ادب لطیف، ادب حریف، ادب کثیف اور ادب ظریف کی نئی نئی اصطلاحیں پیدا کر ظرافت اور طنز کا جو انداز بیان ہے، اسے پڑھنے کے بعد بے اختیار مانپوری کی فکری، فنّی اور ادبی صلاحیتوں کا معترف ہونا پڑتا ہے، یہ اقتباس دیکھئے:

''آپ پوچھیں گے کہ ادب جدید کی مقبولیت کی آخر وجہ کیا ہے تو میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ پُرانے اصول کے مطابق ادیب بننے کے لئے مختلف علوم وفنون پر حاوی ہونا لازمی چیز ہے اور اس مشغولیت کے زمانے میں لیڈری کی ہنگامہ خیز مصروفیت کے باعث بیچارے نوجوان ادیبوں کو اتنا وقت کہاں کہ عروض علم ومعنی، محاورات وزبان پر عبور حاصل کرنے میں وقت ضایع کریں اور یہاں ادبی ذوق ہے کہ قابو سے باہر ہوا جارہا ہے۔ اس لئے انقلاب پسند ادیب کا اشہب قلم سبک خرام رہوار بننے کے عوض اگر شتر بے مہار ہوکر میدان ادب میں دھما چوکڑی مچائے اور اس بگ ٹوٹ دوڑ میں کسی جملہ یا عبارت یا اوس کے مفہوم کی ہڈی پسلی ٹوٹ جائے تو اس جدّت پسند ادیب کا کیا قصور۔ چونکہ ان کی طرح طرح کی گل افشانیوں کی بدولت انواع واقسام اور رنگ برنگ کے جدید ادب کی بہت سی شاخیں پیدا ہوگئی ہیں اس لئے موجودہ میدان کا لحاظ کرتے ہوئے ادب جدید کی قسموں کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

ادب شریف:۔ علمی، تحقیقی، تاریخی معلومات سے جسکو تعلق ہوا سکو ادب شریف کہتے ہیں۔

ادب لطیف:۔ درحقیقت یہ جذباتی ادب ہے۔ جدید طرز نگارش کی بدولت اس کے معنی اور مفہوم اپنی انتہائی لطافت کے باعزّت الفاظ میں اس طرح جذب ہوجاتے ہیں کہ بظاہر صرف الفاظ

ہی الفاظ نظر آتے ہیں۔اسی لطافت کے باعث اس کا نام ادب لطیف رکھدیا گیا۔اس ادب لطیف کی بھی بہت سی شاخیں پیدا ہوگئی ہیں۔ادب نحیف،ادب ضعیف،ادب خفیف۔ادب لطیف کی یہ تینوں قسموں میں بہت ہی معمولی فرق ہے۔اس میں کسی میں تو خیالات بہت بلند ظاہر کرنے کی کوشش کیجاتی ہےاور الفاظ کی کمزوری اور سستی ادب نحیف یا ادب ضعیف کے زمرہ میں اسکو پہنچا دیتی ہے اور کسی میں وسیع تخیل اور بلند جذبات کیلئے مناسب الفاظ نہ ملنے کے باعث جملوں کے بیچ میں نقطہ یا لکیر دیکر پڑھنے والے کی ذہانت پر چھوڑ دیا جاتا ہے یا کسی میں شاندار بھاری بھرکم الفاظ کے بوجھ سے باریک معنی اور نازک مفہوم کی ہڈی پسلی چور چور ہو جاتی ہے۔

ادب حریف؛۔ یہ پرانے ادب کو نیچا دکھانے کیلئے قدیم ادب کا حریف اور مدّ مقابل بنا کر عروض،قافیہ اور ادب کی دوسری پابندیوں سے آزاد کر دیا جاتا ہے۔پُرانے ادب سے للٰہی بغض کا یہ عالم کہ قدیم اُدبا کی غزل گوئی مقابلین عریاں ہزل گوئی کو ترجیح دیجاتی ہے۔

ادب کثیف:۔ یہ دراصل ادب حریف کی پیداوار ہےاور غالباً قدیم ادب کو شکست دینے کیلئے یہ ایجاد بندہ والا ادب اُچھالا جارہا ہے۔ہاں اس ادب کثیف میں اور ایک بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس کا اب اصلی موضوع روٹی قرار دے دیا گیا ہےاور عورت ''سکنڈ لینگوج'' ہو کر رہ گئی ہے۔اس روٹی کے سلسلہ میں عورت اب ادبی چکّی میں آٹا کے ساتھ گھن کی طرح پیسی جانے لگی۔

....

ادب کے مذکورہ بالا قسموں میں ادب لطیف،ادب نحیف،ضعیف، کثیف کے علاوہ ایک آخری قسم ''ادب ظریف'' ہے۔جسکو اس زیر نظر مجموعہ مضامین سے خاص تعلق ہے۔ادب ظریف کا مقصد ادب میں شگفتگی اور اس کے پڑھنے والوں میں زندہ دلی پیدا کرنا ہے۔''

(مطائبات،صفحہ:10.13)

''مطائبات'' کے مقدمہ کے بعد اس انشائیوں کے مجموعہ کے ''انتساب'' پر نظر پڑتی ہے۔جسے اپنے دور کی مشہور سیاسی،سماجی و ادبی شخصیت ڈاکٹر سید محمود کے نام کیا گیا ہے۔اس انتساب کو مانپوری نے روایتی طور پر پیش نہیں کیا، بلکہ جدت پیدا کرتے ہوئے انتساب کئے جانے والے ڈاکٹر سید محمود کے تعارف اور تعریف میں پورے دو صفحہ کا اپنے مخصوص انداز میں مضمون ہی لکھ دیا ہے

۔یہ انتساب بھی بڑا دلچسپ ہے۔پہلے تو انھوں نے ڈاکٹر سید محمود کو ڈاکٹر ہونے پر انھیں مریضوں کا ڈاکٹر سمجھ لیا اور یہ بھی سمجھ لیا کہ چونکہ ان کی ڈاکٹری نہیں چلتی ہے اس لئے ان سے جو بھی ملنے آتا ہے،وہ اپنا مرض بیان کرنے کے بجائے اپنی ڈگری اور سٹیفکیٹ دکھاتا ہےاور ایک درخواست دیتا ہے ۔لیکن جب انھیں اس بات کا علم ہوا کہ وہ دراصل ادب کے ڈاکٹر ہیں تو انھیں کچھ سبکی محسوس ہوئی اور ان سے مزید ملنے کی خواہش ہونے لگی۔اس تعلق سے مانپوری لکھتے ہیں:

''....اس کے بعد انکے علمی مقالے،تحقیقی اور تاریخی مضامین ، ادبی تحریریں دیکھ کر اس جامع شخصیت سے ملنے کا خیال اشتیاق کی حد تک پہنچ گیا اور صرف دو ہی ایک دفعہ اور وہ بھی کم وقفہ کہ ملاقات میں انکے ادبی ذوق کی تڑپ نے میرے حسن عقیدت میں اور بھی پختگی پیدا کر دی۔انکے وسیع معلومات، بلند خیالات کے ساتھ ساتھ علم دوستی اور ادب نوازی کا جو نقش اپنے دل میں لئے ہوئے آیا ۔اسی کا یہ اثر ہے کہ میں اپنی اس ناچیز مجموعۂ مضامین کو جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب جیسی قابل قدر ہستی کے نام کے ساتھ منسوب کرنا باعث افتخار سمجھتا ہوں۔

(مطائبات،صفحہ:4)

انجم مانپوری کی خواہش کے مطابق ان کے انتقال (27/اگست 1958ء) کے بعد 1963ء میں ان کا چوتھا مجموعہ ''مرنے کے بعد'' شائع ہوا۔جس میں (1) مرنے کے بعد (2) انٹرویو (3) ناخواندہ مہمان (4) جھوٹ کا نباہ (5) اسٹیشن کی سیر، جیسے پانچ دلچسپ اور اہم انشائیے ایک سو دس صفحات پر مشتمل ہیں۔انجم مانپوری کے اس چوتھے اور آخری انشائیوں کے مجموعہ کا پیش لفظ مانپوری کے ایک نواسے ابومنظر نے ''ذکر انجم'' کے عنوان سے لکھا ہے۔جس میں انھوں نے انجم مانپوری کے شخصی احوال و کوائف کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔یہی شخصی احوال تقریباً ہر جگہ نقل کئے گئے ہیں یا پھر کسی حد تک مانپوری کی شخصیت کے تعلق سے ان کے رشتہ دار اور مشہور ادیب قیوم خضر اور معین شاہد نے کیا ہے۔ان دونوں کے علاوہ مانپوری کی شخصیت کے حوالے سے مجھے کوئی تفصیل دیکھنے کو نہیں ملی۔اس لئے مانپوری کے اس چوتھے مجموعہ انشائیہ میں موجود درج بال انشائیوں کے ساتھ ساتھ ابومنظر کا پیش کردہ ''مقدمہ'' ''ذکر انجم'' کے عنوان سے ہے۔ اپنے اس ''مقدمہ'' میں ابومنظر نے مانپوری کے نام آئے کئی خطوط کو نقل کیا ہے،لیکن ان کا حوالہ نہیں دیا ہے ۔اگر حوالہ ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ مذید خطوط حاصل کئے جانے کی کوشش کی جاتی۔جو میرے خیال میں کئی لحاظ

سے اہمیت کے حامل ہوتے۔ ویسے ''ندیم'' میں شائع ہونے والے مشاہیر کے خطوط بھی اس خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

بہرحال اس چوتھے اور آخری مجموعہ ''مرنے کے بعد'' میں شامل پہلا انشائیہ ''مرنے کے بعد'' جو کہ ڈھاکہ سے شائع ہونے والا رسالہ ''خاور'' کے 1952ء کے ایک شمارہ میں شائع ہونے کے بعد کافی مشہور ہوا تھا۔ کئی رسائل نے اس انشائیہ کو اپنے رسالوں میں نقل بھی کیا تھا۔ اس انشائیہ میں مانپوری نے اپنی ہونے والی موت کے بعد کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ مادّی دور کے دوست، احباب کے چہرے سے نقاب اٹھاتا نظر آتا ہے جو ان کی زندگی میں تو ان کے بڑے ہمدم، غمگسار دوست تھے۔ لیکن جب ان کی موت کی خبر ان دوستوں کے درمیان پہنچی اور ان کے جو سلوک دیکھنے اور سننے کو ملے، اسے دیکھنے اور سننے کے بعد مانپوری کے سارے بھرم کھل گئے کہ زندگی میں یہ لوگ خوب دوستی کا دم بھرتے تھے، لیکن مرنے کے بعد ان لوگوں کی ساری محبت اور خلوص کے دکھاوے ثابت ہوئے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''..... میں یہ سوچنے لگا جن دوستوں کے بہترے کام محض دوستی کی بنا پر کرتا رہا۔ جن احباب کی خاطر جھوٹی گواہی تک دی جن عزیزوں کے واسطے مال کو مال، جان کو جان نہ سمجھا، مرنے کے بعد قبر پر فاتحہ پڑھنا تو کجا آنکھ بند ہوتے ہی آنکھ بدلنا اور جنازہ تک میں شریک نہ ہونا اور شرکت بھی کی تو جیسے قبرستان کاٹے کھاتی ہو اور دوست کی لاش بھوت بن کر گلا دبانے کو تیار ہو، اس طرح بغیر فاتحہ پڑھے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا، آخر کیوں یہ حالت ہے......''

اس انشائیہ میں مانپوری نے اپنے اردگرد کے سماجی رشتوں کی زبوں حالی پر گہرا طنز کیا ہے اور دکھایا ہے کہ جو لوگ زندگی میں اپنا ہونے کا دم بھرتے ہیں اور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ اس شخص کے مرتے ہی کس طرح نظر بدل لیتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مانپوری نے اپنے اس انشائیہ میں زندگی کی ننگی حقیقت پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ سماجی زندگی کے سفر میں کیسے کیسے لوگ طرح طرح کے روپ بدل کر سامنے آتے ہیں۔ اس کے لئے انھیں ایک شب، خواب میں ہی سہی مرنا پڑا اور مرنے کے بعد ان کے ذہن میں جو کچھ تھا انھیں وہ دکھا کر سماج کے اس کریہہ روپ کو بھی اجاگر کر دیتے ہیں۔

اس طرح ''مرنے کے بعد'' کے پانچ عدد انشائیوں کو جوڑ کر چالیس کے قریب مانپوری

کے طنزیہ مزاحیہ مضامین سامنے آئے، جو کئی جہتوں سے بڑے اہم، دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔ جن میں مانپوری اپنے مخصوص اسلوب میں سماجی، معاشرتی اور تہذیبی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔ میں نے مندرجہ بالا سطور میں جن انشائیوں کا تجزیہ کیا ہے ان میں، میں نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ انشائیے سماج کے کس پہلو کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ کر اس بات احساس کرا رہے ہیں کہ سماج کی ان پراگندگیوں میں کس قدر تعفن بھرا ہوا ہے۔ مغرب زدہ اور جدید تہذیب کے مضر اثرات پر بھی مانپوری کی گہری نگاہ تھی۔ جن کا برملا اظہار اپنے مخصوص اور منفرد اسلوب میں انھوں نے ٹیوشن، سفارش، میرا سفر، انڈر گریجویٹ، اینٹی فادر کانفرنس، ہوسٹل لائف، اسٹوڈنٹ لائف، ہمارے داروغہ جی اور دوستی وغیرہ میں بخوبی کیا ہے۔ ان انشائیوں میں متنوع موضوعات ہیں، جو خوش طبعی، رنگا رنگی اور بزلہ سنجی سے بھرے ظریفانہ نمونوں کے ساتھ طنز کے جو کبھی نرم اور کبھی سخت چبھتے ہوئے مکالموں سے معمور ہیں۔ جو میرے خیال میں یقینی طور پر ادب ظریف کے اعلیٰ معیار پر اترتے ہیں۔ ان میں مانپوری کی غیر معمولی مشاقی اور فنّی گرفت کا اظہار اور پرتو بہت ہی نمایاں ہے۔ جو لطیف احساسات وجذبات، شوخی اور شگفتگی سے پُر مزاح کی چاشنی اور طنز کے تیر ونشتر ہیں وہ مانپوری کو طنز وظرافت میں اعلیٰ مقام عطا کرتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا میں نے درج بالا سطور میں تفصیل سے تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان تمام انشائیوں کے مطالعہ کے بعد، اس صنف ادب سے تعلق رکھنے والے دوسرے ان کے ہمعصر انشائیہ نگاروں فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، پطرس بخاری، شفیق الرحمٰن، اور رشید احمد صدیقی وغیرہ کے انشائیوں کا موازنہ کیا جائے تو ہم بلاخوف وتردید یہ کہنے میں حق بجانب ہونگے کہ انجم مانپوری جس مقام کے مستحق تھے، انھیں وہ مقام نہیں دیا گیا۔ کیوں نہیں دیا گیا یا طنز وظرافت پر لکھی گئی تحقیقی کتابوں میں بھی ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس پر ہم اپنے ایک دوسرے عنوان ''اعتراف، اعتراض اور اعتبار'' میں جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

انجم مانپوری بحیثیت شاعر

انجم مانپوری کی پوری شخصیت کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ بلا کے ذہین انسان تھے۔ان کے اندر اتنی ساری خصوصیات موجود تھیں کہ ہر خصوصیت میں ایک خاص رنگ وآہنگ کا جوہر چھپا نظر آتا ہے۔ان کے سلسلے میں اگر یہ کہا جائے کہ ان کی ذات ایک انجمن کی حیثیت رکھتی تھی، تو غلط نہیں ہوگا۔ان کے انشائیوں میں جس طرح طنز وظرافت کے اعلیٰ نمونے دیکھنے کو ملے اور جن کے مطالعہ کے بعد انھیں ایک اعلیٰ اور منفرد انشائیہ نگار قرار دیا گیا۔اسی طرح اپنی نثر (انشائیوں) میں ایسے شاندار تخلیقی مزاج رکھنے والے مانپوری جب شاعری کی جانب رُخ کرتے ہیں تو یہاں بھی اپنی انفرادیت اور اہمیت برقرار رکھتے ہوئے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری میں اظہار خیال کر کے یہ احساس کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ دونوں طرح کی شاعری کے فکری وفنّی تقاضوں کو پورا کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔انجم مانپوری سنجیدہ شاعری کے لئے انجم تخلص رکھا کرتے تھے اور مزاحیہ شاعری اور انشائیوں کے لئے مانپوری لکھا کرتے تھے۔یعنی کبھی انجم اور کبھی مانپوری بن کر وہ لوگوں کے سامنے اپنی نگارشات سامنے لایا کرتے تھے۔اس سلسلے میں وہ خود ہی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں:۔

ناری ہوں نہ میں اور نوری ہوں میں — باغی ہوں نہ میں اور نہ جی حضوری ہوں میں
کبھی سنجیدہ مضامین، کبھی طنز ومزاح — گہہ انجم و گہہ مانپوری ہوں میں

انجم مانپوری نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو طنز وظرافت تک محدود نہیں رکھا، بلکہ بقول محمد محفوظ الحسن 'ان کا اشہب قلم نظموں اور غزلوں کے میدان میں بھی دوڑا ہے اور ان دونوں کے علاوہ قطعات و رباعیات میں بھی انھوں نے طنز ومزاح کے گل و بوٹے کھلائے ہیں۔لیکن بقول جمیل مظہری 'اعتبار کی آنکھوں میں کمال کے لئے جگہ نہ تھی اور مانپوری کے پاس صرف کمال تھا۔مانپوری کی شاعری کس معیار کی ہوا کرتی تھی اور وہ اپنے نثری کارناموں کے ساتھ ساتھ اپنی سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری میں کس حد تک فکری وفنّی معیار کو برقرار رکھنے میں کامیاب

تھے۔اس کا اندازہ مانپوری کے دوسرے انشائیوں کے مجموعہ ''طنزیات مانپوری'' حصہ دوئم میں علاّمہ جمیل مظہری کے اس خوبصورت اعتراف سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''بہرحال اپٹوڈیٹ شاعری میں انہوں نے خاص اپنی شاعری کے جو نمونے پیش کئے ہیں وہ ڈنکے کی چوٹ پر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مانپوری نے اگر نثر کے ساتھ نظم کو بھی اپنی شاعری کا آلہ بنایا ہوتا تو اکبرالہ آبادی مرحوم کی خلافت کا مسئلہ بغیر کسی نزاع کے ان کے ہاتھ پرطئے ہوجاتا ہے۔آپ ملاحظہ فرمائیں۔ان اشعار کو کچھ ٹھکانہ ہے ان کی بے پناہی کا ۔

سائے کا دامن تھا اونچا دل میں حسرت رہ گئی
صرف ٹانگوں سے لپٹ کر خاک تربت رہ گئی
کورٹ شپ کے بعد پہلو گرم ہوگا یا نہیں
یہ پروبشنر کبھی کنفرم ہوگا یا نہیں
عاشق ہوں ایک نرس کے حسن وجمال کا
کہتے ہیں سب مریض مجھے ہسپتال کا

اس آخری شعر کی خلش گوئی ہمارے عظیم آباد کے نوجوان طلباء سے پوچھے۔منظر کشی میں بھی مانپوری اپنے رنگ کے اچھوتے ہیں۔چنانچہ سرراہ ان کی دیہات کی صبح کا ایک حسین منظر ملاحظہ ہو۔

گوبر کی بھینی بھینی سی خوشبو کی وہ لپک
گوبر کا ڈھیر گڈھے کے پانی کی وہ مہک
ہوتے ہی صبح نکلا ہراک گھر سے بے دھڑک
وہ سلسلہ گرہست کا بستی سے کھیت تک
رُخ ہے کسی گرہست کا کھلیان کی طرف
لوٹا لئے چلا کوئی میدان کی طرف

یوں تو اس قسم کے تمام نمونے شاعری کے موجودہ میلانات پر چبھتی ہوئی تنقیدیں ہیں۔لیکن ان کی نظم معرّا اور نظم پابند سن کر تو بے اختیار مانپوری زندہ باد کہنے کو جی چاہتا ہے۔ادب لطیف کے نام سے جو خرافات آج کل کے رسالوں میں نکل رہے ہیں ان پر اس سے بہتر طنز میری نظر سے نہیں گزرا۔حالانکہ وہ

تمام بہترین مضامین اور بہترین نظمیں میرے پیش نظر ہیں جو ممتاز حسین عثمانی مرحوم کے ادبی جہاد کے سلسلہ میں اودھ پنچ کی زینت بنتی رہی ہیں۔''

انجم مانپوری نے اپنی شاعری کا اعلیٰ نمونہ اپنی موت سے قبل لکھی ایک نظم ''داستان عبرت'' میں موجود ہے۔ جس میں اپنے دلچسپ ماضی، حال اور مستقبل کی یادوں کے احساسات وجذبات عکاسی کی اس خوبصورتی سے کی ہے کہ یہ نظم پڑھنے والے کو خود کے حالات پر سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ انجم مانپوری اپنی اس نظم میں اپنے بیتے ہوئے دن کی پُر لطف زندگی کو یاد کرتے ہیں۔ گیا میں اپنی کوٹھی کے قریب بہتی پھلگو ندی کی دلفریب روانی، اس کے قریب کے سبزہ زاروں کے مناظر کی یاد انھیں ستاتی ہے، شام گئے بے تکلف دوستوں کی جب محفل جمتی تھی اور کبھی گھر کی چھت پر رات گئے غزل چھیڑی جاتی تھی اور شعر خوانی کی شمع روشن ہوا کرتی تھی۔ زندگی کی پرلطف بہاروں میں کبھی ڈنر، کبھی ٹی پارٹی کبھی پکنک کی مہمان نوازی اور کبھی میز بانی کے دسترخوان سجتے تھے۔ اس طرح زندگی کے وہ دن، عید تو شب، شب برات ہوا کرتی تھی۔ لیکن بے رحم وقت کے ایک جھٹکے نے سب کچھ ختم ہو گیا۔ اب تو بس اندھیری قبر ہے، کل تک جو شبستاں میں تھے اور جو لوگ ان کی مدح سرائی میں مصروف رہا کرتے تھے، وہ آج لحد میں پڑے اپنوں کی فاتحہ خوانی کے بھی محتاج ہیں۔ اس پوری نظم میں لطف سے بھری زندگی کی یادیں ہیں اور حزن وملال کے ساتھ ساتھ دنیا چھوڑ جانے کے دکھ ودرد کا احساس بھی ہے۔ دنیا میں رونقیں ہی رونقیں تھیں لیکن آنکھ بند ہوتے ہی یہ راز منکشف ہوا کہ دنیا تو دراصل سرائے فانی تھی۔ درد وغم اور مادّی دنیا کی بھرپور عکاسی انجم نے اس نظم میں کی ہے۔ جو ہر لحاظ سے متاثر کرتی ہے۔ اس میں طنز ہے، نہ مزاح ہے بلکہ صرف اور صرف زندگی کی حقیقت بیانی ہے کہ زندگی میں کیسی کیسی بہاریں تھیں، دوست احباب تھے، خوش گپیاں تھیں۔ ہر طرف ان کے چاہنے والے اور مدح سرائی کرنے والے تھے۔ وقت ایسے گزر رہا تھا، جیسے ہر طرف رعنائیاں، باغ وبہار فضائیں، بہتے چشمے، پہاڑوں کے ریگزار اور حسن کی وادیوں کی سیر کر رہے ہوں۔ لیکن موت جب آئی تو سب کچھ ایک پل میں ختم ہو گیا۔ وہ رعنائیاں ہیں، نہ وہ دل فریبیاں ہیں، نہ حسین اور پُر فضا بہاریں ہیں۔ بس اندھیری قبر میں گم ہیں۔ جب کہ زندگی میں ہر جانب روشنی کی ضوفشانی تھی لیکن موت کے بعد انتہا تو یہ ہے ان کے دوست بھی ان کی قبر سے کترا کر نکل کر جاتے ہیں۔ ایسے المناک لب ولہجہ میں اس جذباتی اظہار کو پڑھنے کے بعد لوگ نہ صرف مغموم ہو جاتے ہیں بلکہ پل بھر کے لئے ہی سہی اپنے آخری انجام کو

شدّت سے محسوس کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ انجم مانپوری نے انتقال سے چند روز قبل ہی ایک نظم بہ عنوان ''لوح مزار'' لکھی تھی۔ جسے ان کے انتقال کے بعد ان کی قبر کے لوح تربت پر کندہ کر دیا گیا تھا۔ اس نظم کو معین شاہد صاحب نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''کلام انجم مانپوری'' کے صفحہ 99-200 پر شامل کیا ہے۔ انتقال سے قبل لکھی اس نظم میں جو حال بیان کیا گیا ہے، وہ بہت ہی عبرت ناک، غم ناک اور المناک ہے۔ انجم نے ان لمحوں کے اپنے احساسات وجذبات کو جس طرح شعری پیرایۂ میں سمویا ہے، اسے ملاحظہ کریں:

تصویرِ عبرت

ہماری قبر سے کترا کے جانے والے دوست
کبھی ہماری بھی پرلطف زندگانی تھی
کنارے پھلگو کے تھی دلفریب جائے سکوں
جو خوشنمائی میں خود آپ اپنا ثانی تھی
نظارہ سامنے اس پار سبزہ زاروں کا
ندی کے دھارے میں ممتاز اک روانی تھی
برآمدے میں سرشام دوستوں کی نشست
بہم مذاق تھا آپس میں چھیڑ خوانی تھی
سماں ہے یاد شب ماہ کھُلی چھت پر
غزل سرائی، سخن گوئی، شعر خوانی تھی
کبھی ڈنر، کبھی ٹی پارٹی، کبھی پکنک
تھی مہمانی کبھی، گاہ میزبانی تھی
جو دن تھا عید، تو شب تھی شب برات اپنی
نہ پوچھ کیسی مسرت کی زندگانی تھی
مگر اٹھا جو طلسم حیات کا پردہ
وہ حجتیں تھیں نہ وہ بزم شادمانی تھی

اندھیری قبر میں ہیں آج کل شبستاں میں
ہر ایک گام پہ بجلی کی ضوفشانی تھی
لحد میں فاتحہ خوانی کو آج ہیں محتاج
کل اپنی طرز نگاری کی مدح خوانی تھی
غرض یہ آنکھیں ہوئیں بند اپنی جب انجم
کھلا یہ راز کہ دنیا سرائے فانی تھی

انجم مانپوری کی ''تصویر عبرت'' آج بھی دھندلی یادوں کی طرح ان کی قبر پر اسی لوح کے ساتھ لگا ہوا ہے اور عبرت کی روداد سنا رہا ہے کہ دیکھو کل تک میرے ارد گرد کس قدر شادمانی تھی، خوشیاں رقصاں تھیں، لیکن آج میں یہاں بے یار و مددگار پڑا ہوں اور یہی حشر ایک دن سبھوں کا ہونے والا ہے۔

انجم مانپوری کے بارے کہا جا سکتا ہے کہ جس مانپوری نے اپنی پوری زندگی اپنی ظرافت نگاری ، اپنے چلبلے جملوں اور اپنی حاضر جوابی سے لوگوں کو قہقہے لگانے پر مجبور کیا کرتا تھا۔ اسی انجم نے اپنی سنجیدہ شاعری میں گہرے احساسات و جذبات کو جگا کر رُلایا بھی ہے۔

انجم مانپوری کا مکان گیا کی پھلگو ندی کنارے واقع تھا۔ اس پھلگو ندی پر انھوں نے پوری ایک نظم اسی عنوان سے کہی ہے۔

اس پھلگو ندی میں 1946ء میں زبردست طغیانی آئی تھی۔ اس سیلاب میں انجم مانپوری کے بہت سارے قیمتی اثاثے کو بے حد نقصان پہنچا تھا۔ اسی نقصان میں ان کا شعری اثاثہ بھی شامل تھا۔ جو ایک ٹین کے بکس میں بند کر رکھ دیا گیا تھا۔ جو بہت دنوں تک اِدھر اُدھر بے کار سی شئے سمجھ کر ہوتا رہا۔ ٹین کے بکس میں محض بے کار پڑے بوسیدہ کاغذات کو اپنے زمانے کے مشہور افسانہ نگار اور صحافی معین شاہد کے چھوٹے بھائی نے تقریباً ضائع شدہ کاغذات سمجھ کر معین شاہد کے پاس بھجوا دیا کہ وہ دیکھیں کہ یہ سب کیا ہے۔ جب معین شاہد نے اسے کھولا تو اس میں انجم مانپوری کا بہت ہی خستہ حالت میں شعری خزانہ نکلا۔ اس خزانہ کو بڑی محنت سے سجا سنوار کر ایک شعری مجموعہ ''کلام انجم'' کے نام سے ترتیب دے کر ڈاکٹر قمر رئیس کی رائے کتاب کے فلیپ پر اور اندرونی صفحات پر ڈاکٹر عبدالمغنی اور جناب شہاب الدین دسنوی کے مضامین شامل کر دسمبر 1979ء میں شائع کر یقیناً ایک اہم ادبی فریضہ انجام دیتے ہوئے بہت قیمتی اثاثہ کو کسی طرح

محفوظ کر دیا۔ جس میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ''انجم مانپوری کو نظم و نثر دونوں اصناف ادب پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ معین شاہد نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ ''مانپوری نے اپنی نظموں میں بھی طنز و مزاح کے وہ پھول کھلائے ہیں، جن کی مہک گلستان ادب میں آج بھی پھیل رہی ہے اور مشام جاں ادب کو معطر کر رہی ہے۔ اس کی بہترین مثال وزیر بننے کا خواب، میونسپل کمشنری کا ماتم، ذلّت آمیز اعزاز، بڑے میاں کی شادی، میونسپل کمشنر کا سہرا، عشاق کا مطالبہ وغیرہ نظمیں ہیں۔''

انجم مانپوری کی جن نظموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان نظموں کے علاوہ طنز و مزاح سے بھرپور انجم کی کئی ایسی نظمیں ہیں مثلاً دیہات کی صبح، خدا کی دین، اپٹوڈیٹ سراپا، اندھی نگر چوپٹ راج، نئی تہذیب وغیرہ میں بھی انجم نے اپنے فنّی و فکری مشاق کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کی ان کے جسم و پے میں طنز و مزاح رواں رہا کرتا تھا۔ بات سے بات کیسے پیدا کی جائے اور ان میں طنز کے تیکھا پن کے ساتھ ساتھ مزاح کی چاشنی شامل کر فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا جائے۔ اس میں وہ ماہر تھے۔ لیکن یہی انجم مانپوری جب سنجیدہ شاعری میں اپنی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ایسے ایسے قیمتی افکار و خیالات پیش کرتے ہیں کہ ان کے مطالعات و مشاہدات کے جذباتی اظہار خیال پر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ طنزیہ و مزاحیہ کلام کے بعد معین شاہد نے اپنی مرتب کردہ کتاب میں انجم کی سنجیدہ شاعری کو ترتیب میں رکھا ہے۔ اس ترتیب میں کچھ رباعیات اور قطعات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نعت شریف ہے اور پھر انجم کے اس شعر کو الگ سے نقل کیا ہے۔

انجم آسان ہے، انسان کا فرشتہ ہونا　　لیکن انسان ہو انسان، بڑی مشکل ہے

اس شعر کے بعد سنجیدہ نظموں کا سلسلہ ہے۔ جس میں انجم کے فکر و احساس میں ڈوبی ہوئی بے حد معیاری سنجیدہ شاعری سے واسطہ پڑتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ ان تمام سنجیدہ نظموں کے عنوانات چونکنے اور نظموں کی معنویت کے گہرے سمند میں اترنے پر مجبور کر دیتا ہے ۔ پیغام عمل، داستان عبرت، انجام ندامت، مقدس راجگیر، مقبرہ شیر شاہ، کتاب عبرت، نہنگ اجل، حدیث دگراں، حقیقت مسلم، موج ساحل وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں، جن میں انجم نے فکر و معنی اور حسن و معیار کی ایسی دنیا آباد کی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس سمندر ڈوبتا چلا جائے۔ ایسی اعلیٰ اور معیاری شاعری سے متاثر ہونے کے بعد معین شاہد نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے: ''حسن خیال، زبان و بیان کی بالیدگی، شاعرانہ فکر و نظر اور شدت

جذبات نے انھیں اقبال اور حالی سے قریب تر کر دیا ہے۔''

لیکن میرا خیال ہے کہ معین شاہد نے کچھ زیادہ ہی محبت اور عظمت کا ثبوت دیتے ہوئے انجم مانپوری کی شاعری کو علاّمہ اقبال اور حالی کی شاعری کی صف میں کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ انجم مانپوری کو صرف طنز و مزاح نگار کے خانہ میں مقید نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری ایسی ضرور ہے کہ ان پر خصوصی توجہ دی جائے۔ جن لوگوں نے ان کی شاعری پر اچٹتی نگاہ ڈالی ہے، وہ اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ انجم مانپوری کی شاعری میں احساسات وجذبات کے فنکارانہ اظہار و بیان کا جو منفرد انداز ہے، وہ اردو نظموں اور غزلوں میں اہم مقام عطا کرتا ہے۔

اس سلسلے میں انجم مانپوری کی شاعری کے حوالوں کے ساتھ نامور نقاد پروفیسر عبدالمغنی نے منصفانہ اور ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے جس طرح کا اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر یہ اقتباس پیش خدمت ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی کی رائے کو میں اس لئے بھی شامل کر رہا ہوں کہ انجم مانپوری کی شاعری کو معین شاہد نے اقبال اور حالی سے قریب بتایا ہے اور پروفیسر عبدالمغنی ماہر اقبالیات بھی ہیں۔ اس لئے ان کی رائے اہمیت کی حامل ہے۔ ملاحظہ کریں، پہلے انجم مانپوری کی کچھ شعری تخلیقات اور اس کے بعد ڈاکٹر عبدالمغنی کی ان پر تنقیدی اظہار رائے:

بجائے علم و ہنر سیکھے ایٹی کیٹ فقط!
میں بن کے نکلا ہوں کالج سے اپٹوڈیٹ فقط!
کلب کا رہتے ہوئے کیوں میں ورکشاپ میں جاؤں
وہاں مشقت ومحنت ، یہاں ڈیبیٹ فقط
سنان وتیغ وسپر لے کے چل دیئے مجھ سے
حوالہ کرکے چھری کانٹا اور پلیٹ فقط
میں کورٹ شپ کی پروبشنری کی مدت میں
تھا ان کے ساتھ مگر ایزے کنڈیڈیٹ فقط
ہے اب تو نظموں میں عورت کے ساتھ روٹی بھی
ادب کے پردہ میں اب رہ گیا ہے پیٹ فقط

عدو کے کیس کی ہر روز رہتی ہے پیشی
مرے معاملے میں ڈیٹ پر ہے ڈیٹ فقط
میں چرن شدر کے برہمن بھی
ہائے کیا چیز ہے الکشن بھی
کچھ تو بے پردگی کا تھا پردہ
اُٹھ گیا در سے اب وہ چلمن بھی
مردے ووٹر بھی ہوگئے زندہ
حشر سے کم نہیں الکشن بھی

☆

کیا غم ہے عیب گرمری چال اور چلن میں ہے
عیبوں کا پردہ پوش تو کھدر بدن میں ہے
مرنے پہ بھی نجات نہیں کنٹرول سے
پرمٹ کا اب بکھیڑا ہمارے کفن میں ہے
بے شرمیاں وہ ڈانس کلب کی نہ پوچھئے
خلوت میں تھی جو بات وہ اب انجمن میں ہے
اب تک تو مان پورؔی کے مصنوعی دانت تھے
مصنوعی اب زبان بھی ان کے دہن میں ہے

☆

جب جیبوں سے رقمیں لینی تھیں اور جیل کا خوگر ہونا تھا
پھر تو پک پاکٹ کے بدلے قوم کا لیڈر ہونا تھا
مردانہ صورت وسیرت کی کیا کہیے ذلت ورسوائی
ہے سیفٹی ریزر ان ہاتھوں میں جن میں خنجر ہونا تھا

☆

شبِ وعدہ نہ جذبِ عشق میرا کچھ بھی کام آیا
نہ خود آئے نہ فون آیا ، نہ اک ٹیلی گرام آیا
گذاری عمر ساری ایک مس کے کورٹ شپ ہی پر
نہ نسبت کا گیا خط اور نہ شادی کا پیام آیا

☆

اندھیرا مچ رہا ہے اب برق مغرب سے
تاریک ایشیا ہے یورپ کی روشنی سے
یہ صرف ڈانٹتے ہیں ،دے دیتا ہے وہ دھکے
صاحب سے بڑھ کے ڈر ہے صاحب کے اردلی سے

☆

ڈراونؔ کی اچھل کود ایک مدت تک مگر
ارتقا کے چندزینوں تک اچک کررہ گیا
پہنچا منزل پرمحقق اور نہ ملحد ایک بھی
ایک تھک کر رہ گیا اور اک بھٹک کر رہ گیا

☆

رنگ و روپ اپنا بدلتے رہے پولیٹکس میں
لیڈری کرنا ہوگر بہروپیا ہوجایئے
خواجگی کی شان میدانِ عمل میں جب نہیں
پھر تو گھر میں بیٹھ کر خواجہ سرا ہوجایئے
وضع سادھو کی بنا کر زن پرستی کیجئے
دیویوں کو پوجئے اور دیوتا ہوجایئے

☆

انجم مانپوری کی معنویت سے بھرپور شعری پیشکش کے بعد ان اشعار پر پروفیسر عبدالمغنی کس خوبصورتی کے ساتھ اپنی تنقیدی بصیرت کا اظہار کرتے ہیں، یہ دیکھئے:

''ان دلچسپ اور خیال انگیز اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ زبان و بیان کے وسائل اظہار پر مکمل قدرت کے ساتھ ساتھ انجم مان پوری کا ذہن بھی مسائل حاضرہ پر محیط تھا۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے مغرب پرستی کی بدعتوں پر سخت تنقیدیں کی ہیں اور تجدد نوازوں کی دکھتی رگوں کو چھیڑا ہے بلکہ وقت کے سیاسی نیز علمی موضوعات پر بھی اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ انجم مان پوری پر اکبرالہ آبادی کے شعور اور شاعری دونوں کا زبردست اثر ہے۔ نت نئے فیشن پر جوفقرہ بازیاں، انجم نے انگریزی الفاظ ومحاورات کا جس مؤثر طریقے سے استعمال کر کے کی ہیں ان کی چستی اور چاشنی کے پیش نظر اگر دونوں شاعروں کے اشعار بغیر حوالہ مصنف کے پہلو بہ پہلو رکھ دیئے جائیں تو تمیز سخت مشکل ہوگی۔ اکبر کی روشن فکر وفن پر اس پختگی کے ساتھ چلنا کسی معمولی فنکار کے بس کی بات نہیں، اس لئے کہ اکبر نے محض تضحیک وتمسخر نہیں کیا ہے بلکہ طنز ومزاح کے پردے میں نہایت سنجیدہ تنقید حیات کی ہے اور اظہار و بیان میں شعر وادب کی مسلم روایات کا لحاظ کیا ہے۔ چنانچہ اکبر کے نشتر گویا بدلتے ہوئے سماج کے فاسد مادوں پر عمل جراحی کرتے ہیں۔ یہی غیر معمولی کام انجم مان پوری نے بھی اپنی مزاحیہ شاعری نیز نثر سے کر دکھایا۔ لہٰذا اردو کی ہجویہ شاعری (Satircal Poetry) میں اکبرالہ آبادی کے بعد جس شاعر کا نام آنا چاہئے وہ انجم مان پوری ہی ہیں۔''

(کلام انجم مانپوری، از: معین شاہد، صفحہ: 11)

انجم مانپوری کی طنز یہ ومزاحیہ شاعری کے ضمن میں معروف نقاد ڈاکٹر ابوذر عثمانی بھی کافی مثبت تنقیدی رویہ اپناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مانپوری مرحوم نے اکثر اشعار اور نظموں کی دل چسپ پیروڈی لکھی ہے اور ایسے اشعار کا وافر ذخیرہ چھوڑا ہے، جن میں طنز ومزاح کا بھرپور رنگ ملتا ہے۔ اگر مانپوری مرحوم اس طرف باضابطہ توجہ کرتے تو ان کے ذریعہ اردو کی مزاحیہ شاعری میں بڑا قابل قدر اضافہ ہوتا۔ علامہ جمیل مظہری کا یہ خیال بالکل غلط نہیں ہے کہ ''مانپوری نے اگر نثر کے ساتھ نظم کو بھی شاعری کا آلہ بنایا ہوتا تو اکبرالہ بادی مرحوم کی خلافت کا

مسئلہ بغیر کسی نزاع کے ان کے ہاتھ پر طے ہوجاتے۔''

(فنکار سے فن تک از: ابوذر عثمانی، صفحہ: 181)

ویسے اپنی شاعری کے سلسلے میں انجم مانپوری کا یہ اعتراف بھی بڑا ہی دلچسپ ہے:

؎ تک بندیوں میں باتیں کہہ جاتے ہیں تہہ کی — کیا ورنہ مانپوری کو شوق شاعری سے

حقیقت یہ ہے کہ انجم مانپوری نے اپنی شاعری کا جو بیش قیمتی اثاثہ چھوڑا ہے، ان میں معنویت کی جو تہ داری ہے اور جس طرح اپنے عہد کے مختلف شعبۂ حیات کی تصویر پیش کی ہے، وہ سب ان کی بھرپور شاعرانہ صلاحیتوں کے مظہر ہیں، جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہم اس بات سے انکار بھی نہیں کرسکتے ہیں کہ انجم مانپوری کی اتنی شاندار اور جاندار شاعری پر ان کے انشائیے بلاشبہ حاوی ہیں۔

انجم مانپوری بحیثیت صحافی

بہار کی ادبی صحافت کے میدان میں بھی انجم مانپوری نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں، افسوس کہ اب تک اس کا کوئی نعم البدل سامنے نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی آج بھی لوگ انجم مانپوری کے ادبی ماہنامہ ''ندیم'' اور اس کے بہار خاص نمبر کو تلاش کرتے ہیں۔ جو میرے خیال میں بڑی صحافتی کامیابی ہے۔

اس لئے انجم مانپوری کے کامیاب صحافتی سفر پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ انجم مانپوری نے سب سے پہلے ایک نیم مذہبی رسالہ ''رہ نما'' کا اجراء 1914ء میں کیا تھا۔ اسی رسالہ سے انجم مانپوری کا صحافتی سفر شروع ہوتا ہے۔ لیکن انجم مانپوری کی صحافتی ناتجربہ کاری اور مالی دشواریوں کی بنا پر یہ رسالہ زیادہ دنوں تک نہیں جاری رہ سکا۔ دراصل ان ہی دنوں انجم مانپوری کے سامنے ذریعہ معاش کا مسئلہ کھڑا ہوا تو وہ بحالت مجبوری اپنے وطن کو چھوڑ کر لاہور پہنچ گئے۔ جہاں ان کی ملاقات مولانا ظفر علی خاں جیسی اہم شخصیت سے ہوئی۔ جن کی طنز وظرافت اور اردو صحافت کے میدان میں زبردست شہرت اور مقبولیت تھی۔ اس زمانے میں ان کے اخبار ''زمیندار'' کی ہر طرف دھوم تھی۔ ظفر علی خاں نے از راہ عنایت معمولی تنخواہ پر انجم کو اپنے اخبار میں ملازمت دے دی اور کچھ دنوں بعد انھیں اپنے اخبار کا سب ایڈیٹر بھی بنا دیا۔ اس اخبار کی سب ایڈیٹری اور ظفر علی خاں کی قربت اور پھر لاہور کی ادبی وصحافتی فضا نے انجم کے ذوق وشوق کو نہ صرف جلا بخشی بلکہ ''زمیندار'' جیسے بڑے اور مشہور اخبار میں کام کرتے ہوئے انجم نے صحافتی تجربات حاصل کئے۔ کچھ ہی دنوں بعد انھیں وطن کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ وطن کی یاد اور اپنوں کی محبت نے انہیں اپنے وطن گیا لوٹنے پر مجبور کیا۔ گیا واپس آ کر انہوں نے ''انجم کمپنی'' قائم کرتے ہوئے اپنا ذاتی کاروبار شروع کیا اور ان کی انتھک محنت اور کوششوں سے ''انجم کمپنی'' کو تجارتی طور پر کافی فروغ حاصل ہوا۔ معاشی طور پر

جب وہ کامیاب اور مطمئن ہوئے تو ایک بار پھر اردو کی ادبی صحافت کی جانب رجوع کیا اور جون 1931ء سے ایک بے حد معیاری ماہنامہ ''ندیم'' کا اجراء کیا۔ اس وقت ان کی ہمت اور جواں مردی کی تعریف کرنا ہوگی کہ اس زمانے میں گیا میں کتابت وطباعت کی سہولیات میسر نہیں تھیں، پھر بھی ہمت وحوصلہ سے کام لیتے ہوئے اور تمام تر مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے، وہ کئی برسوں تک ''ندیم'' نکالتے رہے اور اپنی ادبی و صحافتی صلاحیتوں سے اس رسالہ کو صف اوّل کا ادبی رسالہ بنا دیا۔ خاص طور پر انہوں نے ''ندیم'' کے 1932, 1933 اور 1935 میں تاریخ ساز ''بہار نمبر'' شائع کر کے صحافتی تاریخ مرتب کر دی۔ بہار کی اردو صحافت کی تاریخ ان خاص نمبروں کے ذکر کے بغیر کسی بھی لحاظ سے مکمل نہیں ہوسکتی۔ 1937ء تک یہ رسالہ اسی آب وتاب سے انجم مانپوری کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ لیکن دھیرے دھیرے انجم کی بڑھتی ہوئی کاروباری مشغولیات اور پھر ان کی علالت نے آگے کا صحافتی سفر جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی اور انہوں نے ''ندیم'' کو اپنے شہر گیا سے تعلق رکھنے والی نامور شخصیت سید ریاست علی ندوی کے سپرد کر دیا۔

اپنی پوری صحافتی زندگی میں انجم مانپوری نے ادبی صحافت کا جو معیار اور وقار قائم کیا، وہ یقیناً آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ''ندیم'' کے بہار نمبر کی شہرت اور مقبولیت اسی طرح برقرار ہے۔ اُس زمانے کے مقابلے اِس دور حاضر میں مسائل کم اور وسائل زیادہ میسر ہونے کے باوجود انجم مانپوری کے ''ندیم'' کے بہار نمبر یا اس نوع کا کوئی خاص نمبر نہیں شائع ہوسکا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یقینی طور پر انجم مانپوری نے بہار کی ادبی صحافت میں تاریخ رقم کی ہے، جسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

''ندیم'' کا پہلا شمارہ جون 1931ء میں انجم مانپوری کے سرمایہ سے ان کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس کے پرنٹر، پبلشر محمد یعقوب تھے اور ناشر کے طور پر سید منظر علی ندوی کا نام شائع ہوا کرتا تھا۔ ایک عرصہ تک ''ندیم'' 8/ 20x30 کراؤن سائز میں معیاری مشمولات کے ساتھ عمدہ کاغذ، کتابت طباعت اور جاذب نظر سرورق کے ساتھ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنا رہا۔ اس پہلے شمارہ میں انجم مانپوری نے بحیثیت مدیر اردو زبان کی خدمت اور اس کے فروغ کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا ''....ندیم کی اشاعت سے اوّلین اور آخرین مقصد زبان اردو کی خدمت ہے۔ آپ دیکھیں گے اس خدمت میں ''ندیم'' بڑی حد تک اپنی الگ اور انوکھی شان رکھے گا'' حقیقت یہ ہے کہ انجم مانپوری نے رسالہ کے پہلے شمارہ میں جس

عزم اور مقصد کا اظہار کیا تھا۔ اس پر وہ ہمیشہ قائم رہے اور اردو ادب میں معروف ادیبوں اور شعرائ کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں خصوصاً بہار کے نوجوانوں کی ذہنی تربیت میں بھی اہم کردار ادا کئے۔

یہ رسالہ چونکہ کافی دنوں تک شائع ہوتا رہا، اس لئے اس کے مدیر معاون مدیر، ناشر کاتب اور مطبع وقتاً فوقتاً بدلتے رہے۔ محمد طٰہٰ ندوی آبگلوی، مدیر معاون کی حیثیت سے 1936ء سے شامل ہوئے۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد عبدالعزیز پیر بیگھوی معاون رہے، ان کے بعد کچھ عرصہ کے لئے احسن رضوی نے بھی مدیر معاون کے فرائض انجام دئے۔ 1937ء تک ''ندیم'' انجم مانپوری کی ادارت اور سرمایہ سے آب وتاب کے ساتھ شائع ہوتا رہا، لیکن دھیرے دھیرے انجم مانپوری کی بڑھتی ہوئی کاروباری مشغولیت صحافتی سفر جاری رکھنے میں سدراہ بنی، جس کے باعث انہوں نے ''ندیم'' کی اشاعت کو بند کرنے کے بجائے اپنے زمانے کے مشہور صحافی اور دانشور ریاست علی ندوی کو سپرد کر دیا۔

''ندیم'' کے شمارہ اگست 1931ء کا میں بطور خاص ذکر کرنا اس لئے چاہتا ہوں کہ یہ وہی شمارہ ہے جس کے صفحہ نمبر 57 تا 61 پر انجم مانپوری کا شہرہ آفاق انشائیہ ''میر کلّو کی گواہی'' شائع ہوا تھا۔ اس شمارہ کا جلد: 1 اور (شمارہ) نمبر 3 درج ہے، یعنی ''ندیم'' کا یہ تیسرا شمارہ تھا۔ جس میں مدیر کی حیثیت سے انجم اور معین (معاون، نہیں لکھا گیا ہے) مدیر کے طور پر عبدالقدوس ہاشمی ندوی کا نام درج کیا گیا ہے۔ اس کا اداریہ ''نظرات'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے، جس میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کئی موضوعات پر ادارئے قلم بند کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں ہی ''ندیم'' کے نام موصول ہونے والے خطوط کا ذکر کیا گیا اور یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ یہ رسالہ اگر لوگوں کا تعاون ملتا رہا تو مسلسل نکلتا رہے گا۔ اس بات کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس رسالہ کو سیاست سے کسی قسم کا واسطہ نہیں ہے۔ مشمولات میں ''میر کلّو کی گواہی'' کے علاوہ خود انجم کا لکھا ایک اور مضمون صفحہ 15 تا 20 پر بعنوان ''سیاسی زبان'' شامل ہے۔ جس میں ہلکے پھلکے طنز و ظرافت کے نمونے ہیں۔ لیکن اس دور کی سیاسی باتوں پر زیادہ توجہ دی گئی اور ضرور یہ تصور کیا گیا ہوگا کہ یہ مضمون ''میر کلّو کی گواہی'' سے بہتر ہے، تبھی تو اس مضمون کو فہرست میں ترجیح دی گئی۔ یہ بات دیگر ہے کہ ''میر کلّو کی گواہی'' کی شہرت کے سامنے یہ مضمون اس حد تک پھیکا پڑ گیا کہ اسے مانپوری نے کسی مجموعہ میں شامل نہیں کیا۔ معین مدیر عبدالقدوس ہاشمی کا ایک طویل مضمون ''رسم الخط'' کے عنوان سے شامل ہے، جس میں بہت ساری زبان کے رسم الخط کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ جگیشر پرشاد خلش کی نظم ''بادل'' اور نسیم

لکھنوی، ایڈیٹر رسالہ فتنۂ محشر لکھنو کی ایک غزل بھی اس شمارہ میں شامل اشاعت ہے۔اس شمارہ میں ایک ایسا افسانہ ''نابینا دور میں'' شائع کیا گیا ہے، جس کے تخلیق کار کی گزارش پر اس کا نام شائع نہیں کیا گیا ہے بلکہ گیا کے ایک بڑے رئیس نے اپنے اس افسانہ کے اختتام پر ''راقم...تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں'' درج کیا ہے۔اس لحاظ سے یہ افسانہ چونکاتا ہے اور پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔

''ندیم'' ستمبر 1931ء کے شمارہ میں ایک بہت ہی خاص بات یہ ہے کہ اردو زبان کے سلسلے میں مانپوری نے اپنے اداریہ ''نظرات'' میں نواب سر علی امام کی صدارت میں تشکیل دی گئی کمیٹی کا ذکر کیا ہے۔اس کمیٹی میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر تارا چند، دیا نرائن نگم، سجاد حیدر یلدرم، مسعود حسین رضوی اور راشد الخیری وغیرہ جیسی اپنے دور کی جید شخصیات کے نام شامل کئے گئے تھے۔اس کمیٹی نے سات عدد سفارشات منظور کئے تھے۔جن میں پہلا یہ تھا کہ بہار اور اڑیسہ میں میٹرک تک اردو زبان کی تعلیم ہر طالب علم کیلئے لازمی قرار دی جائے۔دوسری سفارش تھی کہ پٹنہ یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم کے لئے خاطر خواہ انتظام کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ بہار میں اردو تحریک کے سلسلے میں ''ندیم'' میں انجم مانپوری کا یہ اداریہ اہمیت کا حامل ہے۔اس شمارہ میں گیا میں منعقد ہونے والے ایک جلسہ کی مختصر رپورٹ اس وعدہ کے ساتھ ہے کہ آئندہ شمارہ میں اس کی تفصیل پیش کی جائے گی۔رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ 2/اگست کو تلسی داس کے یوم ولادت پر جلسہ منعقد ہوا اور پھر ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔جس میں جگیشر پرشاد خلش، بسمل الہٰ بادی، کشتہ گیاوی، جناب مقصود اور دیگر شعراء نے شرکت کی۔اس شمارہ میں گزشتہ تین شماروں کی اشاعت پر اطمینان ظاہر کرتے ہوئے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے کہ ''ندیم'' کے گزشتہ شماروں میں شائع ہونے والے مشمولات میں 5 مضامین معاصرین رسالوں، ہمّت، لکھنؤ، روزنامہ شیر رنگون اور ساقی، دہلی نے اپنے جریدہ میں نقل کیا ہے۔ان جریدوں کا شکریہ بھی ادا کیا گیا ہے اور جنھوں نے بغیر حوالہ کے نقل کیا ہے، ان سے حوالہ دئے جانے کی گزارش کی گئی ہے۔اسی شمارہ میں مانپوری کا مشہور انشائیہ ''ماما کی مصیبت'' کے ساتھ ساتھ سریر کابری کی نظم ''چشم عاشق'' بھی شامل اشاعت ہے۔

''ندیم'' جولائی تا اگست 1933ء کا ''بہار نمبر'' ہے، جو کہ 353 صفحات پر مشتمل ہے اور ہر لحاظ سے ایک یادگار اور تاریخی نمبر ہے۔جس کا جلد 2 اور نمبر 12 ہے۔اس خاص نمبر میں 35 عدد صوبہ بہار سے تعلق رکھنے والی مختلف یادگار اور تاریخی تصاویر کو بھی شامل کیا گیا ہے۔''ندیم'' کا پرنٹ لائن اس طرح دیا

گیا ہے۔''برقی پریس، سبزی باغ، بانکی پور، پٹنہ میں چھپا اور محمد یعقوب پرنٹر پبلشر نے دفتر ندیم پنچایتی اکھاڑہ، گیا سے شائع کیا'' اس خاص نمبر کے اداریہ ''نظرات'' میں انجم مانپوری نے کئی اہم مسئلوں کو کئی ٹکڑوں میں پیش کرتے ہوئے اپنی باتیں رکھی ہیں۔تاریخی ''بہار خاص نمبر کے اداریہ ''نظرات'' میں بہار کی ادبی بہار کا اعتراف کرتے ہوئے انجم مانپوری لکھتے ہیں:

''صوبہ بہار میں شیر شاہ اور اکبر کے عہد میں اردو شعراء کا کلام پایا جاتا ہے۔جس زمانہ میں دہلی اور لکھنؤ اردو شاعری کے مرکز بنے ہوئے تھے۔اس وقت عظیم آباد بھی اردو کے با کمال شعراء سے بھرا ہوا تھا۔..لیکن افسوس ہے کہ اس صوبہ کے اکثر اردو مصنفین اور شعراء گمنام رہے اور صوبہ بہار سے باہر کی دنیا کو ان کی صلاحیت اور قابلیت سے واقفیت نہ ہوسکی'' (صفحہ:4) وہ آگے لکھتے ہیں۔

''اپنچ'' کے بلاشبہ بند ہو جانے کے سبب بہار کے لوگوں کی تخلیقات دوسروں تک نہیں کے برابر پہنچے۔...ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صوبہ بہار اردو انشا پردازوں اور شعراء سے خالی ہے۔ندیم کے بہار نمبر کا مقصد اس خیال کی تردید ہے۔''

(ایضاً،صفحہ:10)

اس خاص نمبر میں جیسا کہ میں نے بتایا کہ بہت سارے ایسے مواد شامل ہیں، جو کہ آج تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ان میں خود مانپوری کا مشہور انشائیہ ''اڈیشنل وائف'' (صفحہ:84) کے ساتھ ساتھ ان کا ایک اور مضمون بہ عنوان ''معصوم ہستیاں'' شکیلہ اختر کا ایک افسانہ ''شبنم کے دو قطرے'' سید سلیمان ندوی کا بے حد اہم مضمون ''بہار میں اردو'' اور جمیل مظہری کی ایک غزل بھی مشمولات میں شامل ہیں، جو اس خاص نمبر کو گرانقدر بناتے ہیں۔

انجم مانپوری کی ادارت میں شائع ہونے والے اس ادبی رسالہ ''ندیم'' کے خاص بہار نمبر نے ادبی دنیا میں بلاشبہ دھوم مچا دیا تھا۔ہر جانب سے تعریفی خطوط کا سلسلہ جاری رہا۔ان خطوط میں ایسے بہت سارے خطوط کو ''ندیم'' کے مختلف شماروں میں شائع بھی کیا گیا۔خاص بات یہ رہی کہ اپنے دور کے کئی بڑے اخبارات و رسائل میں کئی اہم شخصیات کے تبصرے بھی شائع ہوئے تھے۔لاہور سے شائع ہونے والا مشہور اخبار ''حمایت اسلام'' اپنے 28 نومبر 1935ء کے شمارہ لکھتا ہے:

''عظیم آباد مغل کلچر کا مشرق میں آخری بڑا مرکز تھا۔الحمدللہ کہ ندیم نے اس مغل

تہذیب، آرٹ اور ادب کا ایک جلوۂ دلکش اپنے خاص بہار نمبر میں دکھلایا ہے۔ بہار نمبر میں آرٹ کی کئی اعلیٰ تصویریں بھی شائع ہوئی ہیں۔ ٹائیٹل نہایت خوبصورت اور دلآویز۔ مضامین تمام کے تمام اعلیٰ پایہ کے علمی اور تنقیدی ہیں۔ کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جس کو ٹھوس اور پرلطف نہیں کہا جا سکے۔ ہم اس کامیاب نمبر پر جناب انجم صاحب مدیر ندیم کو تہ دل سے مبارک باد دیتے ہیں۔''

مشہور زمانہ اخبار ''صدق جدید لکھنؤ، کے مدیر اور اردو ادب کی معروف شخصیت مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''ندیم'' کے بہار نمبر پر کیا خوبصورت اور بامعنیٰ تبصرہ کیا ہے، یہ دیکھئے:

''دارالمصنفین سے ندیم کا ''بہار نمبر'' مل گیا۔ ماشاءاللہ خوب ہی نہیں بہت خوب ہے۔ خصوصاً ادبی حیثیت سے آپ یقین فرمائیے کہ مجھے بہار والوں کے ساتھ دلی محبت ہے۔ یہ بات پنجاب دکن ہی کے ساتھ نہیں یہاں کہ اودھ کے باہر صوبہ آگرہ کے لئے بھی نہیں پایا۔ ندوہ والوں نے مجھے اعزازی ندوی بنالیا، جی چاہتا ہے یوں ہی اعزازی بہاری بن جاؤں۔''

لاہور کے ''یادگار'' نے اپنے اکتوبر ۱۹۳۳ء کے شمارہ میں ''ندیم'' کے بہار خاص نمبر کو اردو کی تاریخ میں پہلی مثال سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا تھا:

''مولانا انجم نے یہ نمبر شائع کر کے صحیح وطن پرستی اور جذبہ وطنیت کا ثبوت دیا ہے۔ غالباً ادب اردو کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے کیونکہ آج تک یہ سعادت کسی دوسرے رسالے کو نصیب نہیں ہوئی آپ کی اس جذبۂ پسندی نے صوبہ بہار کی تاریخ کو ادبی جھلک دے کر نہایت دلچسپ بنا دیا ہے۔''

انجم مانپوری نے ''ندیم'' کی اشاعت کر کے بہار کی ادبی صحافت میں ایک شاندار اور سنہری تاریخ رقم کی ہے، جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس کہ اتنے اہم ادبی رسالہ کو اب تک تحقیق و تنقید کی روشنی میں نہیں دیکھا گیا۔ اگر اس جانب سنجیدگی سے توجہ دی جائے تو مجھے یقین ہے کہ ''ندیم'' کے شماروں میں سے ایسے بہت سارے نایاب مواد ملیں گے، جن کی عہد حاضر میں اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ نہ صرف مختلف تدریسی اداروں کے کام آئینگی بلکہ بہار کے اردو ادب کے تعلق سے قیمتی اثاثہ کے طور پر ہمارے لئے مشعل راہ ہوں گی۔

اعتراف، اعتراض اور اعتبار

میں نے مندرجہ بالا سطور میں لکھا ہے کہ مانپوری بے پناہ ذہین فنکار تھے اور بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی مطالعے کی گہرائی اور مشاہدے کی گیرائی نے فہم و ادراک میں کافی وسعت پیدا کر دی تھی۔ جن کے ثبوت، مانپوری کے کئی ایسے مضامین ہیں جن میں انہوں نے سیاسی نظام، سماجی اور معاشرتی تہذیب اور ان قدروں کا انحطاط، مغرب پرستی اور اس نوع کی کئی مختلف طرز حیات کو پیش کرتے ہوئے ظرافت کے ساتھ ساتھ طنز کے تیر برسائے ہیں۔ وہ بات ہی بات میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ قاری ان کے چبھتے ہوئے فقروں میں چھپی لطافت، روح کی گہرائیوں میں اتر کر اس کی کسک اور چبھن محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مانپوری کی ان خصوصیات کا ذکر علامہ جمیل مظہری نے بڑے فلسفیانہ انداز میں اس طرح کیا ہے:

''ان کے مضامین کا تفصیلی مطالعہ کر کے ان کے دل کی گہرائیوں کی تھاہ لینے والوں سے ان کی طبیعت کا یہ چور چھپ نہیں سکتا کہ ان کے قہقہے، قہقہے نہیں بلکہ کراہ ہیں اس درد کی اس ٹیس کی جو ایک شخص کے دل میں اپنے سماج کو نفسیاتی اور اخلاقی کمزوریوں میں مبتلا دیکھ کر ناحق کہتی ہے۔ اپنی معاشرت کی اصلاح کے لئے انہوں نے لیڈری کی جگہ مزاح نگاری کو آلہ کار بنایا اور اس آلہ کار کا انتخاب ان کے حُسن مذاق کی ایک اور دلیل ہے، کیونکہ آدمی اپنے محبوب کو مذاق کے پیرایہ میں سُن کر کھسیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اپنے اوپر تنقیدی نظر بھی ڈالتا ہے اور اپنی جگہ ان عیوب کو دور کرنے کی خاموش کوشش کرتا رہتا ہے''۔

(مقدمہ، طنزیات مانپوری حصہ دوئم صفحہ: 13)

مانپوری نے اسلامی تعلیم حاصل کی تھی اور وہ مشرقی تہذیب اور اس کی قدروں کے علمبردار تھے۔ اس لئے ان کے یہاں مغرب کی تقلید اور اس سے رونما ہونے والی خامیوں پر خوب خوب پھبتیاں اور طنز ملتے

ہیں اور وہ اپنے منفرد اسلوب اور دلکش انداز بیاں سے آئینہ دکھاتے ہیں۔ مانپوری کی شوخی، شگفتگی اور برجستگی ان کے تقریباً تمام مضامین میں موجود ہیں اور یہ خصوصیات ایسی ہیں جو قاری کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں منہمک کر دیتی ہیں اور پھر اسی انہماک (INVOLVEMENT) سے مانپوری فائدہ اٹھاتے ہوئے طنز کے وار کر جاتے ہیں۔

گیا سے، ندوہ، کلکتہ اور لاہور تک مانپوری نے خاک چھانی، جگہ جگہ کی زبان، تہذیب، حالات، قدریں، طرز رہائش وغیرہ کا بڑی گہری نگاہوں سے مشاہدہ اور مطالعہ کیا۔ بہت سارے تجربات سے گذرے اور ان تمام حالات واقعات اور حادثات کو اپنے انشائیوں کا موضوع بنایا اور کردار بھی ایسے پیش کئے ہیں جو تصوراتی نہیں بلکہ حقیقی اور جیتے جاگتے کردار ہیں اور ان کی زبان بھی ایسے ماحول کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ خاص طور پر اپنے علاقے کی مگھی زبان جو عام طور پر وہ بولتے اور سنتے تھے، اس کا بڑے ہی فنکارانہ انداز میں استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مانپوری کے کردار کی زبان اور محاورے برجستہ اور برمحل ہیں جو فطری تقاضوں کو پورا کرتے ہے۔

کردار کے معاملے میں مانپوری کا مقام پطرس، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی وغیرہ سے کم نہیں۔ ان کے صرف ایک کردار ''میر کلو'' کو لے لیا جائے جو کسی بھی لحاظ سے خوجی، حاجی بغلول اور چچا چھکن وغیرہ جیسے مشہور کریکٹر سے کم متحرک نہیں ہے اور اسے ابھارنے میں مانپوری نے بے پناہ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ ''میر کلّو کی گواہی'' بلاشبہ انجم مانپوری کی ایک شاہکار اور لافانی تخلیق ہے۔ لیکن ان کے دوسرے انشائیوں مثلاً کرایہ کی ٹم ٹم، سکنڈ ہینڈ موٹر، مرنے کے بعد، میرا روزہ، میری عید، اینٹی فادر کانفرنس، پاگل خانہ کی سیر، اڈیشنل وائف، میونسپل الیکشن، اپٹوڈیٹ شاعری، آنریری مجسٹریٹ، اسٹوڈینٹ لائف، ہوسٹل لائف، صاحب کا کتا اور اسٹیشن کی سیر وغیرہ جیسے مشہور و مقبول انشائیوں میں بھی طنز و ظرافت کے اعلیٰ اور خوب صورت نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ جن کے مطالعے کے بعد مانپوری کی قدر و منزلت مزید بڑھ جاتی ہے اور یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ مانپوری کو نظر انداز کر کے مسلسل ادبی بددیانتی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ گرچہ اس کے بعد 2010ء میں اظہار خضر کی ''مانپوری۔ احوال و آثار'' کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ جس میں ''میر کلّو کی گواہی'' سے لے کر ''مرنے کے بعد'' تک کل 12

طنزیہ و مزاحیہ مضامین شامل ہیں۔ 2014ء میں معین شاہد (مرحوم) کے صاحبزادے نعیم شاہد نے بھی اپنی مرتب کردہ کتاب ''میر کلّو کی گواہی (انتخاب طنزیات مانپوری) میں انجم مانپوری کے تقریباً ان ہی انشائیوں کو شامل کیا ہے۔

انجم مانپوری کے انشائیوں کے مطالعے کے بعد جہاں میں نے کئی جگہ مانپوری کے بعض انشائیوں کی طوالت پر اعتراض کیا ہے کہ بے جا طوالت اور مبالغہ آمیزی کے باعث کبھی کبھی اُباؤ کی کیفیت طاری ہو تی ہے اور شدت سے اس خامی کا احساس ہوتا ہے۔ میرے اس اعتراض سے پہلے بعض دوسرے مشاہیر ادب نے بھی اسی طرح کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ مثال کے طور پر مانپوری کے دوسرے مجموعہ انشائیہ ''طنزیات'' (حصہ دوم) میں اپنے مقدمہ میں علاّمہ جمیل مظہری نے جہاں مانپوری کے انشائیوں کی خوب پذیرائی کی ہے اور انھیں نظر انداز کئے جانے پر افسوس کا اظہار کیا ہے، وہیں وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ ''مانپوری خدائے سخن سہی لیکن ان کی تحریریں نقص سے کیوں کر خالی ہوتیں اور نقص کیا ہے وہی مبالغہ کا گہرا پن۔ جن میں ہندوستان کے تقریباً تمام مزاحیہ نویس مبتلا ہیں یعنی یہ کہ بعض واقعات اور اصلیت اس کے مقابلہ میں مجہول ہو کر رہ جاتی ہیں۔'' احمد جمال پاشا جو خود طنز و ظرافت کے میدان کے کامیاب مسافر تھے اور جنھوں نے مانپوری کے انشائیوں پر ایک اچھا مضمون بھی لکھا ہے اور مانپوری کو طنز و ظرافت کا بے حد کامیاب فنکار قرار دیا ہے۔ انھیں بھی اس امر کا اظہار کرنا پڑا کہ ''ان (مانپوری) کی مقامیت، ان کا زبان و بیان کے ساتھ عدم توازن، نامانوس الفاظ، فقروں و محاوروں کا بے دھڑک استعمال کھٹکتا ہے۔'' مانپوری کے طنز و ظرافت کو موضوع بنا کر معروف ترقی پسند نقاد ڈاکٹر فصیح ظفر نے ایک بہت ہی معیاری مضمون لکھا ہے اور انھیں نظر انداز کئے جانے پر سخت لہجہ میں تنقید کی ہے۔ لیکن انھوں نے بھی مانپوری کے انشائیوں کے مطالعہ کے دوران اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ''مانپوری الفاظ و محاورات کا استعمال گرچہ برمحل اور برجستہ کرتے ہیں، لیکن اکثر و بیشتر ٹھیٹھ مقامی محاورات کا استعمال کر کے اسے محدود بھی کر دیتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فکر و فن کے سلسلے میں ان کا زاویہ نظر عوامی زیادہ تھا۔ اسی لئے ان کے یہاں پیچیدہ ترکیبیں نہیں ملتی ہیں۔ بھاری بھرکم الفاظ وہ کم سے کم استعمال کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا لب و لہجہ فطری اور غیر تصنع تو ہو جاتا ہے لیکن وہ اکثر و بیشتر اردو کی مخصوص نثری ادبیت سے دور ہو جاتا ہے۔'' مشہور و

معروف ادیب، صحافی اور مانپوری کے بہت قریبی رشتہ دار قیوم خضر نے مانپوری پر کئی مضامین سپردِ قلم کئے ہیں اور مانپوری کو نظر انداز کئے جانے کا شکوہ بھی بہ بانگ دہل کیا ہے، لیکن وہ بھی مانپوری کے انشائیوں میں درآئی طوالت و مبالغہ آمیزی کو فراموش نہیں کر سکے اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ''ایک بات البتہ کھٹکتی ہے کہ کہیں کہیں واقعات کے بیان میں غیر ضروری طوالت، اکتاہٹ اور بے لطفی کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ اگر مانپوری ذرا قلم کو احتیاط اور ایجاز کے ساتھ استعمال کرتے اور واقعہ نگاری میں خواہ مخواہ طول کلامی سے پرہیز کرتے تو ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح کا لطف زیادہ پر کیف ہونے کے علاوہ کارگر اور زود اثر ہوتی۔''

انجم مانپوری کے انشائیوں میں ان چند مشاہیر کے اعتراضات کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ مانپوری کے تمام انشائیے طوالت، مبالغہ، غیر مانوس الفاظ فقروں اور محاوروں سے بھرے ہیں۔ مانپوری کے انشائیوں میں کہاں کہاں ان باتوں کا احساس جاگتا ہے، میں نے مانپوری کے ایسے چند انشائیوں کا جائزہ لیتے ہوئے مندرجہ بالا سطور میں اظہار کیا ہے۔ انجم مانپوری کے شاندار اور یادگار انشائیوں میں ان چند معمولی خامیوں کی بھی یہ خوبی ہے کہ یہ خامیاں مانپوری کے طنز و ظرافت کے فنکارانہ بہاؤ میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ مانپوری کے بیشتر انشائیوں نے اپنے زمانے میں دھوم مچا دی تھی اور ہر طرف ان کا شہرہ تھا۔ ان کے ایک دوست اور جید عالم مناظر احسن گیلانی نے ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا: '' انجم مانپوری کے مزاحیات میرے خیال میں ''کل ہند'' کے مقابلہ میں ممتاز ہیں، بعض فقرے تو اس کے الہام ہیں۔'' ایسے اعتراف کے باوجود مانپوری نے اپنی شہرت کو کبھی بھی خود پر حاوی نہیں ہونے دیا اور نہ ہی شہرت میں اضافہ کے لئے اپنے رسالہ ''ندیم'' کو استعمال کیا۔ اگر وہ اس زمانے میں چاہتے تو اپنی انشائیہ نگاری پر ایسے کئی مشاہیر سے، جن سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے، مضامین لکھوا سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اس جانب کبھی توجہ نہیں دی، شاید یہ ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ یوں بھی وہ مختلف طرح کی مصروفیات میں اس حد تک ڈوبے ہوئے تھے، کہ انھیں ان باتوں کی کبھی پرواہ ہی نہیں رہی۔ اس بات کی شکایت ان کے دوستوں نے بھی کی ہے۔ مانپوری کے اس طرز عمل سے انھیں بڑا نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ جن لوگوں نے بھی اردو طنز و ظرافت پر تنقیدی یا تحقیقی مضامین لکھے، ان تک

مانپوری کی شہرت و مقبولیت نہیں پہنچی ہوگی۔ اس ضمن میں جہاں جمیل مظہری نے مانپوری کے دوسرے انشائیوں کے مجموعہ ''طنزیات'' کے مقدمہ میں اس شکایت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ''اب رہا عوام میں ان کی قدر دانی کا سوال، تو مجھے یہ کہنے میں عذر نہیں کہ مانپوری ابھی تک اپنے ہم وطنوں کی چشم اعتبار میں اپنی جگہ نہیں بنا سکا۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ مانپوری اس کا مستحق نہ تھا بلکہ سچ پوچھئے تو اعتبار کی ان آنکھوں میں کمال کے لیے جگہ نہ تھی اور مانپوری کے پاس صرف کمال تھا۔ وہ غریب نہ فرانس کا والٹیر تھا نہ انگلستان کا اڈیسن نہ لاہور کا پطرس، نہ لکھنو کا شوکت تھا، نہ علی گڈھ کا رشید احمد صدیقی۔ وہ صرف بہار کا مانپوری تھا۔ اس بہار کا جسے معاش کی دھن میں ارباب دولت اور ارباب اختیار کی پرستش سے فرصت نہیں''۔

حقیقت یہ بھی ہے کہ مانپوری کی شہرت صرف ایک انشائیہ ''میر کلو کی گواہی'' تک محدود رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب کہ میں نے ایسے کئی انشائیوں کا ذکر کیا ہے، جو اس مشہور انشائیہ کے مقابلے طنز و ظرافت کے اعلیٰ نمونے قرار دئے جا سکتے ہیں۔ اس ضمن میں مشہور نقاد ڈاکٹر عبدالمغنی مانپوری کی طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات کو سامنے رکھ کر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ''انجم مانپوری کا نام آتے ہی اردو دنیا کے سامنے ''میر کلو کی گواہی'' کی تصویر آ جاتی ہے۔ لیکن مانپوری کا سرمایہ مزاح نگاری اسی ایک تخلیق تک محدود یا اس پر منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ منفرد تخلیق درحقیقت مان پوری کے فن کا نقطہ عروج ہے اور اس کے پس منظر میں اہم مزاحیہ و طنزیہ تخلیقات کا ایک پورا نظام ہے جو کئی مجموعوں پر مشتمل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نثر کے مزاحیہ ادب میں مان پوری کا اثاثہ شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی اور کنہیالال کپور وغیرہ سے کم نہیں ہے، مگر مان پوری کے کارناموں کی مجموعی طور پر وہ شہرت نہیں ہوئی جو ان کے ہم صف دوسرے ادیبوں کو حاصل ہوئی۔ اس صورتحال کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ مان پوری کی نثری تخلیقات کے انبار میں سے انتخاب کر کے ان کی شان دار چیزیں عام پڑھنے والوں کے سامنے نہیں لائی جا سکی ہیں۔'' معروف طنز و مزاح نگار احمد جمال پاشا بھی اپنے ایک مضمون میں مانپوری کے شہرہ آفاق انشائیہ ''میر کلّو کی گواہی'' کی سحر سے نہیں نکلتے نظر آتے ہیں اور ''میر کلو کی گواہی'' کو اعلیٰ کلاسیکی مزاحیہ ادب کی میراث قرار دیتے ہوئے یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ''میر کلّو کی گواہی'' لکھ کر مانپوری نے بقائے دوام کے دربار میں جگہ خاص کر لی۔ اس کے بعد اگر وہ ایک حرف بھی نہ لکھتے تب بھی تاریخ میں ان

کی جگہ محفوظ رہتی۔مرزا طاہر بیگ خوجی، چچا چھکن مرزا جی، قاضی جی، شیطان پڑی مرزا، امجد بیگ و دود بیگ اور میر کلوّ ہمارے مزاحیہ ادب کے بے حد مشہور مزاحیہ کردار ہیں۔

مانپوری نے میر کلوّ جیسا ایک جیتا جاگتا کردار پیش کیا ہے۔ ہر عدالت کو میر کلو سے روزانہ سابقہ پڑتا رہتا ہے۔عدالتیں اور پیشہ ور گواہ کہاں نہیں ہوتے۔ظاہر دار بیگ خوجی اور چچا چھکن کی طرح ہی مکمل ترین مزاحیہ کردار ہے۔میر کلو کی سنجیدگی، بردباری، حاضر جوابی، ذہانت اور فطانت اس کو مزاحیہ کردار بنا دیتی ہے۔نہ وہ خوجی اور قاضی جی کی طرح مسخرہ بنتا ہے اور نہ اسے قاری وسامع کو ہنسانے کے لئے کرتب دکھانے پڑتے ہیں۔میر کلو کے سامنے آتے ہی ہمارے ذہن میں پیشہ ور گواہ کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ یہ مانپوری کا شاہکار ہے۔جس خوبصورتی اور حسن کے ساتھ انھوں نے اس کو نبھایا ہے اس کی مثال ہمارے ادب کے مزاحیہ کرداروں میں بہت کم ملتے ہیں۔

''میر کلوّ کی گواہی'' طنز وظرافت،فن وادب کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ظاہر دار بیگ، ابن الوقت ، چچا چھکن اور خوجی کی طرح یہ بھی ہمارے اعلیٰ کلاسیکی مزاحیہ ادب کی ایک شاندار میراث ہے۔''

انجم مانپوری کو نظر انداز کئے جانے کا شکوہ معروف نقاد ڈاکٹر افصح ظفر کو بھی ہے، لکھتے ہیں ''اردو کے مزاحیہ نگار اور طنز نگار نثر طرازوں کو جب انگلیوں پر گنا جاتا ہے تو کسی کی انگلی انجم مانپوری کے لیے کسی پور پر نہیں رُکتی۔کلیم الدین احمد تو خیر کیا پوچھتے، فرقت کاکوروی اور وزیر آغا بھی اپنے ضخیم مقالوں میں ان کو جگہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ مانپوری بنیادی طور پر شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کے گروہ کے فرد ہونے کے باوجود ان دونوں سے کچھ مختلف بھی ہیں۔تھانوی اور چغتائی کے تخلیقی خزانے میں ایسا کوئی کردار نہیں جو مانپوری کے مخصوص قسم کے تخلیق کردہ کردار میر کلو کا مقابلہ کر سکے اس کی وجہ یہ ہے کہ تھانوی اور چغتائی کے فن میں تفریح کا عنصر غالب رہا۔جبکہ مانپوری اپنے فن کی پیش کش میں اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ چھوٹی سی چھوٹی بات میں کوئی بڑی بات کہہ دی جائے''۔

اسی طرح معروف افسانہ نگار اور مانپوری کے ہم وطن شفیع مشہدی نے بھی مانپوری کو نظر انداز کئے جانے پر اپنی برہمی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ''شفیق الرحمٰن، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی نے بھی اپنی تخلیقات سے طنز ومزاح کے سرمایہ میں اضافہ کیا ہے۔ یہاں بددیانتی ہوگی اگر میں ایک

ایسے گم نام ظرافت نگار کا تذکرہ نہ کروں جو گم نامی کے اندھیرے غار میں گم ہو گیا ہے اور جس سے اردو زبان کے بیشتر قاری و ناقد ناواقف ہیں، میری مراد انجم مانپوری سے ہے۔ان کی دو تصنیفات ''مطائبات مانپوری'' اور ''طنزیات'' اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔'' شفیع مشہدی نے تو مانپوری کو گمنامی کے اندھیرے غار میں ہی گم ہو جانے کی بات کہی ہے، جو کسی حد تک درست ہے۔ مانپوری کو انشائیوں کے تذکروں میں اور اس کی تنقید و تحقیق میں کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے، یہ ایک الگ بحث کا موضوع ہے۔ لیکن اس پر نہ صرف فکر کرنے اور اس کے تدارک کا عمل بہت ضروری ہے۔اب دیکھئے کہ شعبہ اردو، دہلی کے معروف استاد اور نقاد ڈاکٹر قمر رئیس اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے شائع ہونے والی ایک مختصر کتاب'' اردو ادب میں طنز ومزاح کی روایت اور ہم عصر رجحانات۔ایک جائزہ'' جو کہ مارچ 1986ء میں شائع ہوئی تھی۔گرچہ اس کتاب میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے طنز ومزاح نگاروں کا بہت تفصیل سے ذکر نہیں ہے، پھر بھی جن کا ذکر ہے، وہ اتنا مختصر بھی نہیں ہے۔لیکن انجم مانپوری کا ذکر کرتے وقت نہ جانے قمر رئیس کا قلم سست رفتار کیوں ہو جاتا ہے اور وہ اتنا ہی کہنے پر اکتفاء کرتے ہیں کہ ''ظریف کے بعد انجم مانپوری نے اس میدان میں قدم رکھا۔اکبر اور ظریف کی طرح وہ بھی مغربی تہذیب کے نکتہ چیں تھے۔وہ نثر اور نظم دونوں میں یکساں مہارت سے طبع آزمائی کرتے تھے۔اپنے اکثر مضامین اور طنزیہ نظموں کے موضوعات وہ اپنے گرد وپیش سے ہی اخذ کرتے تھے۔ان کے شاہکار مضامین 'میر کلو کی گواہی'، 'پنک آشرم'، اور انڈر گریجویٹ کی تازگی ابھی تک کم نہیں ہوئی۔انھوں نے ہندوستان کی بعض ایسی 'قومی عادتوں' کو بھی تنقید اور تضحیک کا ہدف بنایا جن کی طرف شاذ ونادر کسی کی نظر جاتی ہے۔مثلاً حالی کے بعد جزئیات نگاری کا جو رجحان تھا۔'' قمر رئیس کے ان جملوں کے مطالعہ کے بعد اس بات کا تو اندازہ ہو ہی جاتا ہے کہ انھوں نے انجم مانپوری کو قریب سے جاننے کی کوشش نہیں کی۔جس کے باعث وہ سرسری چند سطری جملوں سے آگے نہیں بڑھ سکے اور یہ بھی ممکن اس لئے ہو سکا کہ جب معین شاہد نے انجم مانپوری کی سنجیدہ اور طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا مجموعہ ترتیب دے کر کتاب کے فلیپ پر تاثرات کے لئے قمر رئیس سے گزارش کی تھی، جسے قبول کرتے ہوئے انھوں نے چند جملوں میں تاثرات قلم بند کر دئے۔کچھ اسی طرح کی شکایت میری خواجہ عبدالغفور سے بھی ہے۔ان کی ایک کتاب ''طنز ومزاح کا تنقیدی جائزہ'' موڈرن پبلشنگ ہاوس، دہلی سے

1983ء میں شائع ہوکر منظر عام آئی تھی۔ اس میں بھی خواجہ عبدالغفور نے بس سرسری چند سطری ذکر مانپوری کا کرتے ہوئے رسم ادائیگی کرتے نظر آتے ہیں اور وہ بھی براہ راست مانپوری کے انشائیوں کا مطالعہ کئے بغیر۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید خواجہ عبدالغفور ''میر کلو کی گواہی'' سے متعلق ایسی بات نہیں لکھتے، جن کا تعلق اس مشہور انشائیے سے تھا ہی نہیں۔ انھوں نے لکھا تھا ''مانپوری منفرد انشأ پرداز اور مزاح نگار ہیں۔ ان کا تخلیق کردہ کردار ''میر کلو'' سماج، سیاست اور معاشرے پر اور ان کی گندگیوں پر بے مثال طنز ہے۔ وہ ہنسی ہنسی میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ پڑھنے والا اس کی چبھن محسوس کرتا ہے۔ نظم ونثر میں ان کا قلم گل و بوٹے کھلاتا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ ہند و پاک میں طنز و مزاح پر تحقیقی وتنقیدی مقالے بڑی تعداد میں نہیں تو کم بھی نہیں لکھے گئے ہیں۔ اس موضوع پر کئی کتابیں بھی شائع ہوچکی ہیں اور ان میں مانپوری کو نظر انداز کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ محمد طفیل کے رسالہ ''نقوش'' کے ضخیم طنز و مزاح نمبر (فروری 1959ء) ہو یا پھر وزیر آغا کی کتاب ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' (1958) ہو، یا پھر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا مرتب کردہ مجلّہ ''علیگڑھ میگزین'' کا طنز و مزاح نمبر یا کراچی سے شائع ہونے والا رسالہ ''ہم سخن'' کا طنز و مزاح کا خاص نمبر یا پھر حیدر آباد کے مشہور طنز و مزاح کے لئے مخصوص رسالہ ''شگوفہ'' کے خاص نمبر ہوں۔ ان تمام کتابوں ورسالوں میں مانپوری کی عظمت کا اعتراف تو دور، ان کی جھلک بھی دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ انجم مانپوری کو نظر انداز کئے جانے پر افسوس کا اظہار ضرور کیا جا سکتا ہے کہ اس عمل سے اردو انشائیے میں مانپوری نے جو گرانقدر اضافہ کیا ہے اس سے بے خبری اور لاتعلقی کے باعث اس صنف ادب کو بہر حال نقصان پہنچا ہے۔ جس کی تلافی کی کوشش ضرور ہونی چاہئے۔

نمونۂ کلام وانشائیے

- غزلیں
- نظمیں
- رباعیات/قطعات
- میر کلّو کی گواہی (انشائیہ)
- میری عید (انشائیہ)

سنجیدہ غزل

یہ غربت میں خیال دوریٔ منزل تو کیا ہوگا
مگر گھبرائے گا جب بیکسی میں دل تو کیا ہوگا
مرے شوقِ شہادت کی خدا ہی آبرو رکھے
کہیں قاتل نے سمجھا رحم کے قابل تو کیا ہوگا
تھپیڑے موج طوفاں کے کنارے خود لگا دیں گے
خدا تو ہے ،اگر ہے ناخدا غافل تو کیا ہوگا
عجب مشکل میں ہے اب یہ دل مشکل پسند اپنا
جو آسانی سے حل ہوجائے گی مشکل تو کیا ہوگا
یہی ہوگا کہ دن دھاڑے لٹیں گے قافلے والے
جو بن جائے گا رہزن، رہبرِ منزل تو کیا ہوگا
کروں میں خونِ ناحق کا تو دعویٰ حشر میں،لیکن
پشیماں ہو کے دیکھے گا مجھے قاتل تو کیا ہوگا
رہے گا کوشش پیہم پہ یہ ذوق طلب زندہ
جو ہوگی رائیگاں یہ سعیٔ لاحاصل تو کیا ہوگا
خدا کے بدلے تکیہ ناخدا پر ہے جو طوفاں میں
پہنچ کر کشتی ٹکرائی لبِ ساحل تو کیا ہوگا
چلے ہیں شکوۂ بیداد کرنے کو تو آپ انجمؔ
پہنچ کر سامنے ان کے بھر آیا دل تو کیا ہوگا

طنزیہ و مزاحیہ غزل

دیکھئے کیا کیا دکھاتا ہے یہ فیشن دیکھئے
ٹخنوں سے اُوپر ہے اب سایہ کا دامن دیکھئے
شیخ صاحب چھوڑئے اب حور جنّت کا خیال
سینما میں جایئے اور اگزبیشن دیکھئے
غیر رہتا ہے گھُسا ان کے پرائیوٹ روم میں
ہے فقط میرے لئے نو ایڈمیشن دیکھئے
اپنے کتّے کے برابر بھی نہیں رکھتے خیال
اس کا راتب دیکھئے اور میرا راشن دیکھئے
دیکھئے کالج کی ڈگری کو نہ انٹرویو میں
کس منسٹر سے ہے کیا کس کو کنکشن دیکھئے
شیخ صاحب اور بڑھ جائے نہ چربی توند کی
دعوتوں میں ہوتے ہیں کھانے مرغّن دیکھئے
پہلے تھا فُل سوٹ اب ہے صرف گنجی جانگیا
اب لنگوٹی بھی پہنوا دے نہ فیشن دیکھئے
سوٹ نے دھجی اُڑا ڈالی عبائے شیخ کی
شیروانی کا بھی کب نُچتا ہے دامن دیکھئے

حقیقتِ مسلم

قوم کی حالت پہ رونا قوم کا شیوہ نہ تھا　　ہر مسلماں کی زباں پر قوم کا نوحہ نہ تھا
ہر جگہ ذلت کا اپنی اس طرح چرچا نہ تھا　　اپنی اس اسپیچ میں یوں قوم کا دکھڑا نہ تھا

جوش قومی کا فقط معیار تقریریں نہ تھیں
دردِ دل کا آئینہ پُر زور تحریریں نہ تھیں

آہ و نالہ زخمِ مسلم کا نہ تھا مرہم کبھی　　قوم کا دکھڑا نہ تھا افسانۂ عالم کبھی
اس طرح ہوتا نہ تھا اظہار رنج و غم کبھی　　جلسۂ قومی نہ تھا یوں مجلسِ ماتم کبھی

ناامیدی کے تصور سے دلِ افسردہ نہ تھا
باغِ مسلم کا گلِ امید پژمردہ نہ تھا

یوں تباہی پر زمانہ کو نہ کچھ دشنام تھا　　یوں زبانوں پر نہ ذکرِ گردش ایّام تھا
اپنی بربادی کا قدرت پر نہ کچھ الزام تھا　　اپنا ذمہ دار خود ہر پیروِ اسلام تھا

بے نیازی پر خدا کی طعنہ زن بندہ نہ تھا
لب پہ مسلم کے کبھی اللہ کا شکوہ نہ تھا

حیف ہے جس قوم کی توقیر اک عالم کرے　　سامنے جس کے سر تسلیم دنیا خم کرے
نوحہ خوانی سے وہ اپنی آپ عزّت کم کرے　　جس کی فطرت میں ہو جد و جہد وہ ماتم کرے

جو صدا تکبیر کی تھی وہ فغاں کیوں کر ہوئی
جو رجز خواں قوم تھی وہ نوحہ خواں کیوں کر ہوئی

مسلم مایوس کیوں ہے پست ہمت اس قدر　　اپنی اس خود ساختہ حالت پہ ہے کیوں نوحہ گر
تجھ کو شاید خود نہیں اپنی حقیقت کی خبر　　کون ہے اور کیا ہے تو کچھ اس طرف بھی غور کر

کچھ نہیں تجھ میں مگر اسلاف کا جوہر تو ہے
زنگ آلودہ بلا سے ہے مگر خنجر تو ہے

کیوں شکستہ پر بنا ہے ہمت شہباز کر　　تجھ کو جو طاقت خدا نے دی ہے اس پر ناز کر
ہمصفیروں میں بھی اب پیدا کوئی اعزاز کر　　تول پَر اور امتحان طاقتِ پرواز کر

اے گرفتار قفس سن لے یہ مجھ سے راز بھی
کچھ نہ دے ذوقِ اسیری طاقتِ پرواز بھی

بے خبر اپنی حقیقت سے بتاؤں کیا ہے تُو　　قطرۂ ناچیز اپنے کو نہ کہہ دریا ہے تُو
ذرّہ سمجھا ہے مگر اک مہر تابندہ ہے تُو　　زیر خاکستر ہے اخگر لیکن انگارہ ہے تُو

اس زوالِ عارضی پر دیکھ تُو بزدل نہ ہو
وہ ہلال نو نہیں جو پھر مہہ کامل نہ ہو

کون کہتا ہے کہ تجھ میں اب وہ بابت ہی نہیں　　وہ زمانہ ہی نہیں اور اب وہ حالت ہی نہیں
وہ ارادہ ہی نہیں اور اب وہ ہمت ہی نہیں　　سب تو ہے معلوم پر اپنی حقیقت ہی نہیں

دیکھ تجھ میں خود ابھرنے کا ترے سامان ہے
تو ہے وہ قطرہ کہ جس میں بند اک طوفان ہے

ہے تجھے گر قلت تعداد کا اپنی خیال　　خوف ہے تجھ کو نہ کر دیں غیر قومیں پائمال
یاد کیا تجھ کو نہیں خود اپنی وہ روشن مثال　　غیر قوموں میں تھا تیرا شمع و پروانہ کا حال

گو پتنگے کی طرح اک نرغۂ دشمن رہا
بزم عالم میں مثال شمع تو روشن رہا

یکہ و تنہا نمایاں تو ہزاروں میں رہا　　ماہِ تاباں کی طرح روشن ستاروں میں رہا
تجھ کو کچھ کھٹکا نہ دشمن کی قطاروں میں رہا　　بے خلش تو پھول کی مانند خاروں میں رہا

چونکہ تیری قوم حق کی ہر جگہ طالب رہی

اس لیے قلّت تری کثرت پہ بھی غالب رہی

غم نہ کر گر دولتِ دنیا سے تو محروم ہے — اپنے اس افلاس و غربت پر عبث مغموم ہے
وہ سنہرا عہد اپنا خود تجھے معلوم ہے — تو ہو گر مسلم تو پھر دنیا تری محکوم ہے
دولتِ دنیا ترے صبر و قناعت پر نثار
کثرت تعداد دشمن، تیری قلت پر نثار

تجھ کو قدرت نے دیا جو خیر امت کا لقب — اپنے اس اعزاز کا بھی جانتا ہے کچھ سبب
چونکہ ثابت کر دیا اپنے کو تو نے حق طلب — ساری قوموں میں کیا حق نے تجھی کو منتخب
اُٹھ پئے اصلاح عالم خلق کا خادم ہے تُو
کچھ خبر بھی ہے تجھے، تو کون ہے مسلم ہے تُو

اندھی نگری چوپٹ راج

کب تک پنڈت جی مہراج
قرض کی ہنڈیا بھیک اناج
غلے کے انبار کا مالک
دانے دانے کو محتاج

راشن کا اسٹاکسٹ اب تو
کل کا بنیا سیٹھ ہے آج
اونچی اونچی تنخواہیں ہیں
نام کے عہدے، کام نہ کاج

حق تلفی معمول میں داخل
رشوت خوری عام رواج
چوری، ڈاکہ لوٹ کھسوٹ
یاد آتا ہے برٹش راج

بھوکی ننگی ملک کی بہنیں
اس پر بھی کچھ شرم نہ لاج
جوتے جھاڑتے جن کی گذری
بن گئے ملک کے وہ سرتاج

ملک کو یوں بدنام نہ کیجئے
بھارت کی کچھ رکھئے لاج
دشمن کو مت کہنے دیجئے
اندھی نگری چوپٹ راج

رباعیات

کیجئے ستیہ گرہ کھایئے ڈنڈے ہر چند
اس سے ہوگا کبھی سوراج کا پرچم نہ بلند
کہہ گیا بات پتے کی یہ کوئی دانش مند
'' ہر کہ شمشیر زند سکّہ بنامش خوانند''

یاہو مثلِ جناؔح جوش و خروش
یا ہو گاندھؔی کی طرح کام خموش
یا پہن سوٹ یا لنگوٹی باندھ
''درعمل کوش ہر چہ خواہی پوش''

کیوں حال پہ ان کے نہ تبسم آئے
گانا انھیں آئے نہ ترنم آئے
بے لحن کے ملتی نہیں داد اس پر بھی
پڑھنے کو غزل حضرتِ انجؔم آئے

ان سامراجیوں کے نہ فقرے میں آیئے
کیوں اک کو دوست ایک کو دشمن بنایئے
گیہوں وہ دے کے جھونکیں نہ چکّی میں جنگ کی
آٹے کے ساتھ گھن کی طرح پس نہ جایئے

واعظ کے تقدس کو بھلا کیا کہیئے
گر دیکھئے صورت تو فرشتہ کہیئے
دل لیکن ہے اسود کی طرح سخت و سیاہ
پھر کیوں نہ انھیں قبلہ و کعبہ کہیے

بیگم بھی ہیں اور ان کے لیے مؤثر بھی
اور سیرو سواری کی ہیں وہ خوگر بھی
چھٹی نہ کبھی دن کو نہ شب کو فرصت
کیا کیجئے شوہر بھی ہوں اور شوفر بھی

شوہر تو ہیں کھادی کے ہمیشہ پابند
بیگم کو فقط ریشمی جمپر ہے پسند
مخمل کا بلوز اور یہ کھدّر کی قمیض
کیا ٹاٹ کا مخمل میں لگا ہے پیوند

جب قحط و گرانی کے نہ تھے چکر میں
اس وقت تھا کشتی کا بھی سودا سر میں
اب فاقہ کی نوبت ہے تو ورزش کیسی
ڈنڈ پیلتے ہیں چوہے یہاں خود گھر میں

بزنس تو ہے اک درد سری کا پیشہ
آسان ہے دریوزہ گری کا پیشہ
یہ پرس، یہ چندہ، یہ ڈنر اور یہ جلوس
سب سے بہتر ہے لیڈری کا پیشہ

شوخی نہیں وہ خاطر افسردہ میں
رنگینی کہاں اب گل پژمردہ میں
پیری میں ہے یہ زندہ دلی کا اعجاز
اک روح ظرافت ہے تنِ مردہ میں

قطعات

یو.ان.او میں سیاست مابین کی ہے بات
دنیا میں صلح وامن کی اور چین کی ہے بات
یہ پھانسنے کو جال سنہری نہیں ہے ایڈ
کیوں جھوٹ کوئی سمجھے،ٹرومین کی ہے بات

—

کھیل میں طفلی ، جوانی کے کٹے دن عیش میں
ڈھل چکی جب دھوپ اب بھی سوچ کچھ انجام کو
ہے جو پیری میں لبِ بام آفتابِ زندگی
ہے غنیمت صبح کا بھولا جو آئے شام کو

—

بن گیا پھندا گلے کا اور عذر سیل ٹیکس !
ڈال دی گردن میں انکم ٹیکس کی رسی دراز
ہم فقط روزہ گئے تھے بخشوانے کے لیے
مانپوری پڑگئی اپنے گلے اُلٹے نماز

—

کیوں سوالوں کی مسلسل اس قدر بھرمار ہے
میں بھگوڑا یا کسی دربار کا راندہ نہیں
میرے بلوانے کو بھیجا خاص عزرائیل کو
اے فرشتو میں کوئی مہمانِ ناخواندہ نہیں

❋

میر کلّو کی گواہی

احسن اپنے گواہوں کے نہ آنے کی وجہ سے مقدمہ کی تاریخ بڑھانے کیلئے مہلت کی درخواست دے کر بار لائبریری میں اطمینان سے بیٹھا ہوا اپنے وکیل سے باتیں کر رہا تھا کہ اس کا کارپرداز گھبرایا ہوا پہنچا اور بولا کہ گواہوں کی پکار ہو چکی ہے۔ حاکم نے مہلت کی درخواست نامنظور کر دی ہے۔ گواہ حاضر نہ ہوں گے تو مقدمہ خارج کر دیا جائے گا۔ احسن کی بدحواسی دیکھ کر اس کے وکیل نے کہا کہ گھبرانے کی کون سی بات ہے۔ گواہی دینے والوں کی یہاں کمی نہیں۔ چنانچہ فن گواہی کے مشہور ماہر پیشہ ور گواہوں کے استاد میر کلو صاحب بلائے گئے۔ وکیل صاحب نے احسن سے پانچ روپے لے کر ان کے حوالے کئے اور ساتھ لئے اجلاس پر پہنچ گئے۔ میر صاحب حاکم کو سلام کر کے کٹھرے میں جا کر کھڑے ہوئے۔ احسن سخت متحیر تھا کہ مقدمہ کی حالت سے میر صاحب بالکل واقف نہیں۔ مدعا علیہ کون ہے؟ کیا نام ہے، کتنی رقم کا دعویٰ ہے، نہ کچھ بتلایا گیا نہ اظہار کی کوئی تعلیم دی گئی آخر یہ اظہار کریں گے تو کیا؟ غریب سمجھا مقدمہ ہوا چوپٹ۔ فریق کے وکیل کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ احسن کا کوئی اصلی گواہ نہیں آیا ہے۔ میر کلو کو کٹھرے میں دیکھ کر اور بھی خوش ہوا کہ یہ بھاڑے کا ٹٹو کہاں تک چلے گا؟ اگرچہ چیف کے سوالات سے مقدمہ کی نوعیت کا اندازہ کچھ میر صاحب نے اپنی ذہانت سے لگا لیا اور یہ بھی سمجھ گئے کہ احسان علی خان اصلی مقروض کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب بہ حیثیت وارث ان کے بیٹے شاہد خان پر یہ نالش دائر کی گئی ہے۔ لیکن احسان علی خان جنہوں نے تمسک لکھا تھا ان کی صورت، شکل، وضع، عمر سے واقف نہ ہونے کے باعث دل میں کچھ سوچنے لگے فریق کے وکیل نے جرح کے سوالات شروع کر دئے۔ میر صاحب دروغ حلفی کے جرم میں ایک بار سزا پا چکے تھے۔ اس لئے پہلا سوال ان سے یہی کہا گیا۔

وکیل : میر کلو صاحب! آپ کبھی جیل کی بھی سیر کر آئے ہیں؟
میر صاحب: آج کل کون ملک کا خادم ایسا ہے جو جیل سے نہ ہو آیا ہو۔
وکیل : آپ کو ملک کی کس خدمت کے صلہ میں یہ فخر حاصل کرنے کا موقع ملا۔
میر صاحب: وہی قانون شکنی۔

وکیل : کس قانون کے توڑنے کی خدمت آپ نے اپنے ذمہ لی تھی۔

میر صاحب: گاندھی جی نے نمک کے قانون توڑنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور بعض لیڈروں نے جنگلات کے قانون کی خلاف ورزی کو اپنے ذمہ لیا۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ ضرورت قانون شہادت کی اصلاح کی ہے۔ اسی لئے قانون شکنی کے لئے میں نے اسی کو منتخب کیا۔

وکیل : (حاکم کو مخاطب کر کے) حضور یہ دروغ حلفی کے جرم میں سزا پا چکے ہیں۔ مگر اپنی زبان سے صاف اقرار کرنا نہیں چاہتے۔

حاکم : تو آپ اس فیصلہ کی نقل داخل کر سکتے ہیں۔ دوسرا سوال کیجئے۔

وکیل : کیوں میر صاحب! احسان علی مرحوم کو آپ جانتے تھے؟

میر صاحب: اے حضور! جاننے کی ایک ہی کہی۔ خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے۔ ہم دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ نہ مجھے ان کے بغیر آرام، نہ ان کو میرے دیکھے بغیر چین۔

وکیل : ان کی عمر کیا تھی؟

میر صاحب: یہی تیس اور ساٹھ کے درمیان ہی تھی۔

وکیل : یہ تیس اور ساٹھ کے درمیان کہنے سے کام نہیں چلے گا، صاف کہئے وہ بوڑھے تھے یا جوان؟

میر صاحب: عمر کے لحاظ سے تو بہت زیادہ بوڑھے نہیں تھے۔ مگر اکثر بیمار رہنے کی وجہ سے بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔

وکیل : بال سفید تھے یا سیاہ؟

میر صاحب: نزلہ کی وجہ سے بال سفید ہو گئے تھے۔ لیکن جب خضاب لگاتے تھے تو جوان معلوم ہوتے تھے۔

وکیل : رنگ گورا تھا یا کالا؟

میر صاحب: نہایت ہی گورے چٹے آدمی تھے۔ لیکن وہی بیماری کی وجہ سے رنگ کچھ سانولا سا ہو گیا تھا۔

وکیل : لانبے تھے یا ناٹے؟

میر صاحب: قد لانبا تھا لیکن کمر جھک جانے کی وجہ سے ناٹے معلوم ہوتے تھے''

وکیل صاحب نے جھلا کر کہا......''سوال کا صاف جواب کیوں نہیں دیتے۔ یہ کیا کہ لانبے تھے اور ناٹے بھی۔ گورے بھی تھے اور سانولے بھی۔ بال سفید بھی تھے اور سیاہ بھی۔ اس سے حلیہ کا کہیں صحیح

انداز مل سکتا ہے؟''

میر صاحب: جناب خفا ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ ایک دو روز کی ملاقات ہوتی تو البتہ اس وقت کی خاص وضع اور صورت کو بیان کرنا۔ برسوں رات دن کا ساتھ رہا۔ جن مختلف حالات میں میں نے دیکھا صاف صاف کہہ دیا۔

وکیل : اچھا احسان علی مرحوم داڑھی بھی رکھتے تھے یا نہیں؟

میر صاحب: وہ عجیب آزاد وضع اور رندانہ مشرب کے آدمی تھے۔ جی میں آیا تو چاروں ابرو کا صفایا بول دیا۔ اور کبھی داڑھی بڑھائی تو خواجہ خضر کو بھی مات دے دی۔

وکیل : فضول گوئی کی ضرورت نہیں۔ میں نے پوچھا تھا کہ داڑھی رکھتے تھے یا نہیں۔ صرف ہاں یا نہیں کہہ دیتے۔ اس کے علاوہ کچھ زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا بھر کے قصے سے ہمیں مطلب نہیں۔

میر صاحب: بہتر آئندہ سے انہیں دو لفظوں میں جواب دوں گا۔

وکیل : احسان علی خاں مرحوم برابر رہتے کہاں تھے؟

میر صاحب: ''جی ہاں''

وکیل : یہ جی ہاں کیا۔ میں پوچھتا ہوں کہ کہاں رہتے تھے تو آپ فرماتے ہیں ''جی ہاں'' یہ اس سوال کا جواب ہوا؟

میر صاحب: جناب ہی نے فرمایا تھا کہ جواب میں صرف ہاں یا نہیں کہو۔

وکیل : میں نے ہر سوال کے لئے تھوڑا ہی یہ جواب بتلایا تھا۔ اچھا اب کہئے وہ کہاں رہتے تھے

میر صاحب: اپنے مکان میں۔

وکیل : لاحول ولا قوۃ؛ عجیب سمجھ ہے۔ میرا اس سے مطلب یہ ہے کہ شہر میں رہتے تھے یا دیہات میں۔

میر صاحب: دونوں جگہ۔ کبھی شہر کبھی دیہات۔

وکیل : دیہات میں ان کا مکان کس رخ کا ہے۔ آپ تو وہاں بھی ساتھ جاتے ہوں گے۔

میر صاحب: جی ہاں۔ برابر ساتھ دیہات میں جایا کرتا تھا۔

وکیل : اصل سوال کو آپ کھا گئے۔ دیہات میں ساتھ رہنے کو میں نہیں پوچھتا۔ اس کا جواب دیجئے

کہ وہاں مکان کس رخ کا ہے؟

میر صاحب: (اتنی دیر میں جواب سوجھ گیا) شہر میں رہنے والوں کا دیہات میں اکثر تیر بہک جاتا ہے وہاں جب جب گیا سمت کا مجھے صحیح پتہ ہی نہ لگا۔

وکیل : یہ روپے کس کام کے لئے انہوں نے لئے تھے؟

میر صاحب: اپنی ضرورت کے لئے۔

وکیل : کون سی ضرورت۔کیا کوئی خاص ضرورت آن پڑی جو بغیر قرض لئے کام نہیں چلتا؟

میر صاحب: وہ نہایت ہی اولوالعزم تھے۔خاص اور عام دونوں ضرورتیں ان کے لئے ایک تھیں اپنے پاس دو چار ہزار روپے رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔

وکیل : کب روپے انہوں نے لئے؟

میر صاحب: جب ضرورت پڑی۔

وکیل : کتنے دن ہوئے؟

میر صاحب: تین سو ساٹھ دنوں کا ایک سال ہوتا ہے۔اب حساب کرنا اور جوڑ کے بتانا سب ملا کر کتنے دن ہوئے ذرا مشکل ہے۔

وکیل : دنوں کو جوڑ کر بتانے کو نہیں کہتا۔یہ بتلائے کہ کتنے سال ہوئے؟

میر صاحب: تمسک کی مرقومہ تاریخ کو دیکھ کر آپ بھی جوڑ سکتے ہیں کہ کتنے سال ہوئے۔

وکیل : تو صاف کہئے کہ ہمیں یاد نہیں۔

میر صاحب: جی ہاں پڑھنا چھوڑے زمانہ ہوگیا۔اب حساب واقعی یاد نہیں۔

وکیل : حساب کے بھولنے یا یاد رکھنے کا سوال نہیں۔تمسک کب لکھا گیا تھا۔کتنا زمانہ ہوا یاد ہے یا نہیں؟

میر صاحب: زمانہ کے بارے میں جو آپ پوچھتے ہیں تو جہاں تک مجھے یاد آتا ہے انہوں نے اپنی زندگی ہی کے زمانہ میں قرض لیا تھا۔

وکیل صاحب اس اول فول جواب سے سمجھ گئے کہ مقدمہ کے متعلق یہ حضرت کچھ نہیں جانتے۔صرف دفع الوقتی کر رہے ہیں۔لیکن غصہ تو اس کا تھا کہ اور باتوں کے جاننے کا ذکر کیا، مدعا علیہ کی صورت تک نہیں دیکھی اور برسوں کی ملاقات ایک طرف رہی۔رات دن ایک

ساتھ رہنے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے اور اس پر کہیں سے گرفت میں نہیں آتے۔آخر سوچ کر ایک ایسا سوال کیا جس سے وکیل صاحب کو یقین تھا کہ واقفیت اور دوستی کا سارا بھانڈا ہی پھوٹ جائے گا۔وکیل صاحب نے سوال کیا:

وکیل : کہئے میر صاحب! ان کا حرف تو آپ ضرور پہچانتے ہوں گے؟

میر صاحب: یہی تو ایک کمال مرحوم میں تھا۔جس پر وہ برابر فخر کیا کرتے تھے......وہ نہایت ہی خوش نویس ہفت قلم تھے، ہمیشہ مختلف شان سے لکھا کرتے تھے۔قلم پر اتنا اختیار تھا کہ ان کا ایک خط کبھی دوسرے سے ملا ہی نہیں۔''

اس جواب کے بعد وکیل صاحب نے سپر رکھ دی۔دو بجے مقدمہ شروع ہوا تھا۔چار بجنے کو چند منٹ باقی رہ گئے تھے۔حاکم نے مسکرا کر وکیل صاحب سے پوچھا کہ اور کچھ پوچھنا ہے۔وکیل صاحب نے کہا۔''جی نہیں''۔لیکن یکا یک ایک بات یاد آگئی۔حاکم سے کہا کہ حضور صرف ایک اور سوال کر کے جرح ختم کر دیتا ہوں''تمسک کے کاغذات میں ایک جگہ احسان علی خاں مرحوم کے مرض الموت کا ضمناً تذکرہ تھا۔اس کو دماغ میں رکھ کر وکیل صاحب نے سوال کیا۔

وکیل : میر صاحب یہ تو بتلائیے کہ احسان علی خاں مرحوم مرے کس بیماری سے؟''

میر صاحب: (رونی صورت بنا کر) ہائے رونا تو اسی کا ہے کہ ان کے علاج میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا۔حکیم، وید، ڈاکٹر سب کا علاج کیا گیا مگر کسی کو اصل مرض کا پتہ ہی نہیں لگا۔کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ''چوں قضا آید طبیب ابلہ شود''۔

جناب وکیل صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ ان کو موت کی بیماری تھی۔'' چار بج چکے تھے، اجلاس برخواست ہوا۔احسن کو دوسرے روز اپنے گواہوں کو لانے کے لئے کافی موقع مل گیا اور یہ صرف میر صاحب کی بدولت ہوا۔اس روز سے ہر شخص کو یقین ہوگیا کہ گواہوں کو سچے ہونے سے زیادہ ذہین اور حاضر جواب ہونے کی ضرورت ہے۔

(''ندیم'' اگست 1931ء)

میری عید

سچ پوچھئے تو بھلا مجھ سے اور قومی خدمت سے کیا سروکار۔ میں اور خدمت قوم! آپ ہی کہیں کہ اس جملہ میں کہیں سے ربط یا جوڑ ہے؟ مجھ سے اور قومی کام سے واسطہ؟ لیکن خدا سمجھے ان لیڈر ساز لوگوں سے کہ مجھ جیسے بےضرر اور سیدھے سادے آدمی کو بلا وجہ لیڈری کے جال میں پھنسا دیا۔ میں نے بار بار عذر کیا کہ میں کس لائق ہوں مجھے کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں؟ مگر آپ ایسے ہیں آپ ویسے ہیں، غرض مولانا وغیرہ قسم کے چند تعظیمی الفاظ معتقدانہ انداز میں کہہ کر مجھے اس طرح گڑبڑا دیا کہ میں بھی سوچنے لگا کہ عربی کا ایک لفظ پڑھے بغیر مولانا ہو جانا کوئی بڑی عزت نہیں اور پھر اس ڈپریشن کے زمانہ میں لیڈری کا معزز اور منفعت بخش کام برا کیا ہے۔ انہیں باتوں کو سوچ کر لوگوں کے اصرار پر میں نے کہہ دیا کہ گو میں اس لائق نہیں لیکن آپ لوگ لیڈری کے زرّیں طوق کو میرے گلے میں مڑھنا ہی چاہتے ہیں تو۔

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاج قوم میں آئے

میں ملک و قوم کے نوجوانوں کے لئے وقف علی الاولاد ہونے کو تیار ہوں۔ بننے کو تو میں لیڈر بن گیا، مگر ع ''عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا'' والا معاملہ فوراً ہی پیش آ گیا۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ یعنی بحیثیت لیڈر کے اخباروں میں میرے نام کے ساتھ مولانا کا لفظ چکانے کے چند ہی ماہ بعد آ گیا شہر رمضان کا مبارک مہینہ۔ آپ جانتے ہیں ایک تو پہلے سے نماز روزہ قسم کے مذہبی کاموں سے مجھے کوئی ایسی دلچسپی نہیں اور اب لیڈر ہو جانے کے بعد قومی اور ملکی فرائض کو چھوڑ کر مذہبی فرائض کی طرف توجہ کرنے کی فرصت کہاں۔ یہ مذہبی کام تو صرف مولاناؤں کے لئے زیادہ زیبا ہے لیکن جلسہ اور اسٹیج کے مولانا نہیں جیسا کہ خاکسار خادم قوم ہے بلکہ مسجد و منبر والے مولانا اس کے لئے موزوں ہیں۔ گو اس تقسیم

عمل کے اصول پر روزہ میری ڈیوٹی میں شامل نہیں ہو سکتا تھا لیکن دقت یہ آ پڑی کہ مغربی تعلیم کے فیوض و برکات کے باوجود مسلمانوں میں ابھی اتنی روشن خیالی نہیں آئی کہ ان باتوں کو سمجھ سکیں۔ مذہبی مولانا تو خیر ایک بات ہوئی وہ تو عام پبلک کے ساتھ معزز لیڈروں کو بھی مذہب کی ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا جانتے ہیں۔ ان کے خیال میں لیڈر کتنا ہی اعلیٰ مدارج پر پہنچ جائے یہاں تک کہ اس کے ماننے والے خدا بھی سمجھنے لگیں، لیکن ان کے لئے بھی نماز روزہ ضروری۔ ایسے کٹر خیال والوں کے لیڈر ہونے کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ رمضان میرے لئے کس قدر مصیبت انگیز ثابت ہو سکتا ہے۔ بغیر روزہ کے روزہ دار بن کر جن جن مصیبتوں اور پریشانیوں کا مقابلہ مجھے کرنا پڑا کیا کوئی روزہ دار کرے گا۔ آپ یقین مانئے کہ رمضان کے پورے مہینے میں دن کو بھی اطمینان و سکون سے پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ اس طرح کے کھانے کو بھی کھانا کہتے ہیں، کہ کمرہ کا دروازہ بند اور جلد جلد اوپر تلے لقمہ فرو حلق کیا جا رہا ہے کہ کوئی پہنچ جائے۔ چنانچہ باوجود احتیاط کے ایک روز یہ واقعہ پیش آ ہی گیا اس حالت میں کہ میں مصروف ناشتہ تھا بے شان گمان میاں رشید کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان پر نظر پڑتے ہی منہ کا نوالہ منہ میں گولہ بن کر رہ گیا۔ وہ حضرت چند سکنڈ سامنے کھڑے رہ کر مسکراتے رہے اور میں خفت آمیز حیرت سے منہ پھاڑے انہیں دیکھتا رہا۔ بغیر اجازت کسی کے پرائیویٹ روم میں گھس پڑنا اور خاص کر ایسے موقع پر جبکہ وہ رازدارانہ کام میں مشغول ہو کس قدر خلاف تہذیب حرکت ہے۔ اس ناشائستہ حرکت پر انہیں جی میں تو بہت کچھ برا بھلا کہا لیکن اس ڈر سے کہ دوسروں تک یہ قصہ نہ پہنچ جائے زبانی بگڑنا ایک دم مصلحت کے خلاف بات معلوم ہوئی۔ بے موقع دھرے جانے کے باعث میں تو خود کچھ کھسیانا ہو رہا تھا اس پر میاں رشید کی چھیڑ۔ کیوں حضرت! یہ کیا حرکت تھی؟ میں نے خفت آمیز تبسم کے ساتھ کہا آخر شب میں آنکھ کھلی نہیں سحری قضا ہو گئی تھی اسی کو پورا کر رہا ہوں۔ رشید نے ہنس کر کہا روزہ اگر نہیں رکھتے تو کھلے بند کھانے سے کون روک سکتا ہے۔ ع

خدا سے جب نہیں چوری تو بندوں سے کیا چوری

میں نے کہا بات تو ٹھیک ہے لیکن لیڈری کا نازک پوزیشن کچھ ایسا ہے کہ مجھ جیسے خادمانِ قوم

کے لئے اللہ میاں سے رائے عامہ کا لحاظ کرنا ضروری ہے یوں تو طرح طرح کی آوازے مجھ پر کسے جاتے ہیں۔ میری اس اخلاقی جرأت کو لوگ مذہبی بے حیائی کہہ کر اور بھی پھبتیاں اڑائیں گے لیکن یار! آج کی بات ذرا اپنے ہی تک رکھنا۔

شکم پروری کا کام تو چوری چھپے کسی طرح انجام پا ہی جاتا تھا۔ سب سے بڑی مصیبت حقہ پان اور چائے کی تھی حقہ کی تلافی بھی خیر سگریٹ سے ہوگئی اور پان کے لئے بھی کوئی زیادہ دقت نہ پڑی۔ سگریٹ کا بکس اور پان کی بٹی ہر وقت جیب میں موجود۔ جب جی چاہا تخلیہ گاہ جا کر سگریٹ سلگا، دو چار کش پی لیا۔ بٹی سے دو ایک پان کھول کر صاف کر لیا۔ البتہ چائے ایک بکھیڑے کی چیز تھی جس کے تیار کرنے اور پینے میں کچھ نہ کچھ دقت ہونا لازمی، یہ تو تھا نہیں کہ نظر بچا کر چپکے سے ایک چٹکی چائے پھانک لی اور کلی کے بہانے اوپر سے دو تین گھونٹ پانی پی لیا بس ختم شد۔ سماور میں پانی گرم کرنا، کتیلی میں ڈھالنا اور پھر اس میں چائے دے کر رنگ آنے کے لئے تھوڑی دیر چھوڑ دینا پھر پیالی میں انڈیل کر شکر دودھ ملانا۔ ان مرحلوں کے بعد ذرا ذرا گھونٹ پینا۔ مطلب یہ کہ سماور سے لے کر پوری پیالی فرو حلق کرنے تک کم سے کم آدھ گھنٹہ صرف ہونا ضروری اور درمیان میں کچھ ٹھیک نہیں کہ کون پہنچ جائے۔ ان بکھیڑوں کے باوجود کسی نے کہا ہے۔ ع

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

ایک آدمی کو باہر محض اس کام کے لئے متعین کر دیا کہ سامنے سے کوئی آتا دکھائی دے تو فوراً مجھے خبر کرے۔ اس طرح میں میری چائے نوشی بھی جاری رہی لیکن ہونے والی بات ایک روز چائے کی پیالی پینے کے لئے جیسے ہی اٹھائی تھی کہ بخشو نے دوڑے ہوئے آ کر کہا کہ مسعود صاحب آ رہے ہیں۔ بوکھلاہٹ میں کچھ خیال رہا نہیں ایک ہی سانس میں جلدی سے پوری پیالی ختم کرنے کے لئے جو بھر منہ گھونٹ لیا تو مت پوچھئے اس لب سوز چائے نے زباں سوز، ذہن سوز، تالو سوز، بہ یک وقت کئی سوز ہو کر منہ کو ابال کر رکھ دیا۔ بے ساختہ ایک چیخ منہ سے نکل گئی اور ساری چائے منہ سے باہر۔ چیخ سن کر میاں مسعود دوڑے ہوئے کمرے میں پہنچے اور مجھے اس حال میں کہ چہرہ تمتمایا ہوا آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے قمیص

اور پائجامہ بلاٹنگ پیپر بنے ہوئے دیکھ کر حیرت سے پوچھا کہ خیریت تو ہے یہ چائے کی پیالی گری ہوئی، کپڑے بھیگے ہوئے قصہ کیا ہے؟ ضبط کر کے میں نے کہا کچھ نہیں وہ جو روزہ نہ رکھنے والوں کے بارے میں سنا تھا کہ دوزخ میں حمیم پلایا جائے گا اسی کا تجربہ کر رہا تھا۔ میری اس حماقت کا نتیجہ ہوا کہ تمام منہ کے اندر آبلے پڑ گئے۔ کسی چیز کا فرو حلق کرنا مشکل۔ کئی روز تک صرف دن ہی نہیں بلکہ دن رات لگاتار بلا نیت روزے رکھنے پڑے۔ خیر اس جبریہ روزہ کو تو روزہ کہنا ہی نہیں چاہئے۔ لاچاری میں تو سب کچھ جائز ہے۔ یہ روزہ کیا کہیں بے موقع پھنس جانے پر مجبوری میں نماز پڑھ لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ ان تکلیف دہ واقعات کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ رمضان شریف کا مہینہ ایک شریف جنٹلمین کے لئے اور خاص کر جسے خدا نے لیڈری کا بھی اعزاز بخشا ہو کس قدر مصیبت انگیز ثابت ہوتا ہے۔ لیڈری کی ذمہ داریاں، عیب پوشی کی فکر اعتراضوں کا خوف یہ کیا کم پریشان کن تھے کہ اس پر لوگوں کے مہمل سوالات، کہئے روزہ تو خیر خوبی سے گزر رہا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں اللہ کا ایک دم فضل ہے، بھوک اور پیاس کی مطلق شکایت نہیں۔ مجھے تو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ رمضان شریف ہے یا عید کا مبارک مہینہ اور سچ پوچھئے تو یہ جاڑے کا بھی کوئی روزہ ہے۔ لطف تو گرمیوں کے روزہ میں ہے۔ دھوپ کی تیزی سے سارا مکان تپتا ہوا، لب پر بیڑیاں پڑی ہوں، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں، ہواس ٹھکانے نہ ہوں زبان حلق تر کرنے کے لئے بار بار کلی کرنے کی ضرورت پڑتی ہو۔ ایسے روزہ کا البتہ ثواب ہے۔ اس قسم کی باتوں کے بعد کس کی ہمت تھی ظن المؤمنین کے خلاف مجھ پر شبہ کر کے اپنا ایمان خراب کرتا لیکن پھر بھی روزہ دار کی صورت بنائے لوگوں کے یہاں جا جا کر روزہ کے فضائل و مناقب بیان کر کے شکوک کا سدّ باب کرتا رہا۔

اتفاق سے انجمن تبلیغ کے سالانہ جلسہ کی تاریخ اسی رمضاں شریف میں مقرر ہوئی۔ باہر کے مقرر بھی آئے ہوئے تھے۔ خادم قوم ہونے کی حیثیت سے کیسے ممکن تھا کہ میں شریک نہ ہوتا بلکہ تقریر کے لئے مجھ سے بھی اصرار کیا گیا۔ سوچنے لگا کہ کس سبجیکٹ پر تقریر کروں کہ لوگوں پر میری قابلیت کی دھاک بیٹھ جائے موقع اور وقت کے لحاظ سے روزہ سے بڑھ کر اور کوئی بہتر عنوان سمجھ میں نہیں آیا چنانچہ تقریر شروع کر دی۔

''بھائی مسلمانوں! کس قدر افسوس کی بات ہے کہ روزہ داروں سے زیادہ روزہ خواروں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ حالانکہ روزہ کھانے کی چیز نہیں بلکہ صرف رکھنے کی چیز ہے۔ مذہبی عقیدہ سے قطع نظر موجودہ زمانے کے حکماء یورپ اور بڑے بڑے ڈاکٹر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کو اپنی تندرستی قائم رکھنے کے لئے سال میں کچھ دنوں روزہ رکھنے کی سخت ضرورت ہے۔ روزہ انسان کو تحمل، برداشت، نفس کشی ایثار اور جفاکشی کی تعلیم دیتا ہے۔''

غرض روزہ کے فوائد اور اس کے فلسفیانہ نکات پر وہ دلائل پیش کئے کہ سارا مجمع نعرہ تحسین سے گونج اٹھا۔ دس بجے سے جلسہ شروع ہوا تھا اور دو بج چکے تھے۔ گھر سے صرف ناشتہ کر کے چلا تھا بھوک سے بری حالت تھی زبردست دلائل سے یہ ثابت کرنے کے بعد کہ انسان کے لئے روزہ نہایت ضروری اور مفید ہے تقریر کر کے سیدھا گھر پہنچا اور اطمینان سے پیٹ بھر کھانا کھایا تب کہیں جان میں جان آئی۔ کھانا ختم کر کے خلال ہی کر رہا تھا کہ میاں رشید خواہ مخواہ پہنچ گئے اور آتے ہی میری تقریر کی داد دینے لگے۔

رشید: واللہ کیا زبردست اور مدلل تقریر کی ہے۔ روزہ نہ رکھنے والوں کے پاس اس کا جواب کیا ہے لیکن یہ بے وقت دانتوں میں خلال کیا کر رہے ہو؟ کیا تم خود روزہ سے نہیں ہو؟ خدانخواستہ کیا وہ فلسفیانہ جملے صرف زبانی جمع خرچ تھے؟

میں: (مسکرا کر) بھئی تم بھی ایک دم وہ ہو اتنا نہیں جانتے کہ ہاتھی کے دکھانے کے دانت اور ہوتے ہیں کھانے کے اور اگر کھانے اور کھانے والے دونوں قسم کے دانتوں سے میں نے کام لیا تو اس میں تعجب اور حیرت کی کیا بات ہے؟

رشید: جیسی زبردست اور مدلل تقریر کی تھی مرد خدا اس پر عمل بھی کرتے تو اور بھی تمہاری وقعت میرے دل میں بڑھ جاتی۔

میں: لیڈری سے بڑھ کر اور کون سی عزت ہے جس کے لئے آدمی خواہ مخواہ روزہ رکھ کر بھوک کی تکلیف برداشت کرے۔

رشید: آخر روزہ نہ رکھنے کی وجہ کیا ہے؟

میں: میں کہتا ہوں رکھنے ہی کی کون سی وجہ ہو سکتی ہے۔ نصیب دشمنان بیمار تو ہوں نہیں کہ معدہ کی اصلاح کے لئے ڈاکٹر نے فاقہ کا حکم دیا ہو، جس کے لئے مجبوراً روزہ رکھنا ضروری سمجھوں۔ خدانخواستہ سرکاری قیدی بھی نہیں کہ بھوک ہڑتال کے سلسلے میں روزہ رکھوں۔ نہ مجھ سے کوئی بے وقوفی کی حرکت ہی ایسی سرزد ہوئی کہ جس کے کفارہ میں روزہ رکھ کر اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کروں اور نہ میں کوئی مہاتما ہوں کہ لوگوں کی سرد مہری دیکھ کر دنیا بھر کی توجہ اپنی جانب منعطف کرنے کے لئے بیٹھے بیٹھے روزہ کا اعلان کر دوں تاکہ ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک لوگوں کی تارا تاری، پیاما پیامی، جلسہ ہنگامہ اور ساتھ ہی معتقدوں کی خوشامدوں اور منتوں سے لطف اندوز ہوں۔ یہاں کے اپنی یہ حالت کہ رمضان کے تین دن کیا پورے سال بھر بھی روزہ رکھوں تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ان معقول وجوہات میں سے جب ایک بھی وجہ نہ ہو تو پھر خواہ مخواہ آدمی کیوں روزہ کی مصیبت اپنے سر لے۔ باقی رہا مذہبی حکم تو مجھ جیسے آزاد خیال وروشن دماغ لیڈروں کو مذہبی احکام کی جتنی پرواہ ہوتی ہے وہ تم جانتے ہی ہو اگر مسلمان پبلک میں پروپگنڈا کا خوف نہ ہوتا تو اصلی روزہ کا تو سوال ہی نہیں اس مصنوعی روزہ کی بھی ضرورت نہ تھی۔

میری صاف گوئی رشید کو ناگوار گزری انہوں نے خفگی کے تیور سے کہا تو پھر لوگوں کو دھوکا دینے کی کیا ضرورت ہے آج ہی اس مکاری کا سارا بھانڈا لوگوں کے سامنے پھوڑتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ کہیں سچ مچ یہ حضرت میرا کچا چٹھا لوگوں کے سامنے کھول کر نہ رکھ دیں ان کا غصہ دھیما کرنے کے لئے کہا خفا ہونے کی بات نہیں ہے مذہب نے روزہ نہ رکھنے کا کفارہ بھی تو مقرر کیا ہے۔ اس پر رشید نے بگڑ کر کہا آپ جیسے ہٹے کٹے کے لئے نہیں۔ میں نے سوچا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے ٹالنے کے لئے کہا میں مولانا کے پاس لے جا کر اس کے متعلق تمہاری تشفی کرا دوں گا شام کو افطار کے بعد فوراً میاں رشید آدھمکے کہ چل کر مولانا سے کفارہ کے مسئلہ کی تصدیق کرا دو۔ میں نے لاکھ حیلہ حوالہ کر کے جان چھڑانی چاہی مگر ایک تو کٹر مذہبی اس پر ضدی کا ہے کہ میری جان چھوڑنے لگا۔ مجبوراً میں نے بھی سوچا کہ

سنیما جانا ہی ہے اسی طرف سے اس کے ساتھ مولانا کے یہاں کچھ الٹ پلٹ سوال کر کے اس بلا سے پیچھا چھڑالوں گا چنانچہ چلتے وقت یہ شرط منوالی کہ استفتا کے سوالات عام ہوں گے میرا ذاتی قصہ درمیان میں نہ آئے گا (بلکہ پوچھوں گا میں ہی تمہیں کچھ بولنے کی ضرورت نہیں) ان شرطوں کے ساتھ انہیں لئے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوکر میں نے پوچھا ''کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بیچ مسئلہ کے کہ ایک شخص روزہ رکھنے سے مجبور ہے، وہ کس طرح اس کی تلافی کرسکتا ہے'' فوراً فتویٰ مل گیا کہ بھوکوں کو کھانا کھلا کر اس کا کفارہ ادا کرے۔ میاں رشید بگڑ کر کچھ بولنا ہی چاہتے تھے کہ میں نے شرط یاد دلا دی۔ اس کے بعد کچھ اور زیادہ ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا چلنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ مولانا نے بزرگانہ تحکم کے لہجہ میں روک کر فرمایا ''اس محلّہ کی مسجد میں آج ختم تراویح ہے تم دونوں بھی میرے ساتھ چلنا''۔ رشید فوراً ہی راضی ہوگئے اور میں سنیما شروع ہونے کا وقت ختم ہو رہا تھا دل میں دعا کرنے گا کہ یا اللہ اس مصیبت سے نجات دلا۔ گیا تھا روزہ بخشوانے گلے میں پڑی نماز والی مثل سچ مچ پوری ہونا چاہتی ہے۔ آخر بیسیوں حیلے حوالے بعد میں بہ مشکل جان چھوڑی۔ میری وجہ سے میاں رشید کو بھی رہائی مل گئی۔ وہاں سے جیوں ہی دونوں ساتھ باہر نکلے رشید نے بگڑ کر کہا۔

رشید : میں تہذیباً کچھ نہ بول سکا آپ نے مجبوروں کے روزہ کے بارے میں مولانا سے پوچھا جس کا جواب انہوں نے صحیح دیا مگر آپ اس فتویٰ کے رو سے کیسے بری ہوگئے۔ آپ کیسے مجبور کہے جاسکتے ہیں۔

میں : بھئی مجبوریوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ کوئی بیماری سے مجبور ہوا ہے اور میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں،

رشید : (ہنس کر) اچھا صاحب آپ ایک دم مجبور ہیں لیکن کفارہ میں فقیروں کو کھانا بھی کھلاتے ہیں یا نہیں؟

میں : پیشہ ور گداؤں کو کھلانا میں یک دم گناہ سمجھتا ہوں۔ بھوکوں کو کھلانا البتہ ثواب ہے۔ جس وقت میں بھوکا ہوتا ہوں تو اول خویش بادۂ درویش کے اصول پر اپنے سے زیادہ مستحق کو نہیں پاتا۔

رشید : (عاجز آکر) اب میں یک دم قائل ہوگیا۔ جب آپ روزہ نہیں رکھتے تو دوستوں کے یہاں کی دعوت افطار میں خواہ مخواہ شریک ہونے کے کیا معنیٰ؟

میں : اول تو دعوت قبول کرنا سنت ہے دوسرے کیا تم نے یک دم کافر ہی سمجھا ہے کہ ایک تو روزہ نہیں رکھتا اس کے بعد افطار کے ثواب کا بھی منکر ہو جاؤں؟ غرض اس قسم کے چھیڑ چھاڑ کی باتیں کرتے ہوئے ہسپتال کے چوراہے پر پہنچ کر وہ گھر کی طرف روانہ ہوئے اور میں روزانہ معمول کے مطابق لپکا ہوا سنیما کی جانب۔

گورشید کے سوا اور کسی کو بھی میرے روزہ کی حقیقت معلوم نہ تھی مگر پھر بھی چور کی داڑھی میں تنکا کی مثل کے مطابق یہ کھٹکا ہر وقت پریشان کئے رہتا کہ کوئی ناشتہ کے وقت نہ پہنچ جائے۔ کسی کو میری سگریٹ نوشی کی خبر نہ ہوجائے کوئی پان کی سرخی نہ دیکھ پائے۔ اس پر بعض وقت بے موقع رشید کی چھیڑ چھاڑ سے تنگ آکر ایک روز غصہ میں چاہا کہ روزہ رکھ ہی لوں۔ مگر سوچا غصہ میں ایسا کام کر گزرنا جس سے بعد کو پچھتانا پڑے ٹھیک نہیں۔ دوسرے وقت ٹھنڈے دل سے اس پر غور کروں گا۔ رمضان کے آخری روزہ تک اس پر غور کرتا رہا لیکن کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ مختصر یہ کہ رمضان جس پریشانی اور غیر مطمئن حالت میں گزرا خدا کسی دشمن کو بھی اس مصیبت میں مبتلا نہ کرے۔ خدا خدا کر کے اسی طرح رمضان کے پچیس دن گزر گئے۔ پچیسویں تاریخ کو قدرے اطمینان کے ساتھ یہ سوچنے لگا کہ جس خدا نے اتنے دنوں تک بھرم رکھا اس کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ بقیہ چار پانچ دن بھی عزت سے گزار دے پھر تو نہ میاں رشید کی پروا ہوگی اور نہ کسی کا ڈر۔ دو چار روز کسی طرح کاٹنا ہے پھر تو عید ہی عید۔ عید کی خوشی کا تصور باندھ ہی رہا تھا کہ ماما نے کہا سرکار بلا رہی ہیں دروازہ کے اندر جیوں ہی قدم رکھا تھا کہ میری صورت پر نظر پڑتے ہی ایک دم برس پڑیں، آج ہفتوں سے بک رہی ہوں مگر سنے آپ کی بلا سے۔ میرے لئے ساری دوپٹہ، شلوکہ کا کپڑا جوتیاں تو رہیں ایک طرف اس معصوم بچے کے لئے ابھی تک ایک دھجی نہیں آئی۔ عید کے زمانے میں جو درزیوں کے یہاں بھیڑ ہوتی ہے اس کے جانتے ہوئے بھی یہ فکر نہیں کہ کب کپڑے آئیں گے اور کب سلیں گے صرف تین چار روز عید کے رہ گئے ہیں اور آپ کی بے پروائی کا یہ عالم کہ کان پر جوں تک نہیں

رنگتی۔ میں نے متانت سے کہا کہ خفگی کی غرض اگر روزہ بہلانا ہے تو یہ اور بات ہے ورنہ کون سے سامان کی خریداری ہے جس کے لئے ہفتوں پہلے سے دکانوں میں آدمی مارا مارا پھرے، ابھی بخشو کو بھیج کر جس قسم اور جس وضع کے کپڑوں کا حکم ہو، چھکوڑی مل کی دکان سے منگوائے دیتا ہوں۔ اس پر اور بھی بگڑ کر بولیں بس لگا سے گھانس لگانے کی ہمیشہ سے آپ کی عادت ہے۔ بخشو کیا جانے کپڑوں کا حال اور وہ بھی روزمرہ کے نہیں بلکہ عید کے لائق۔ اسے کیا معلوم کہ معمولی اور قیمتی بنارسی ساریوں میں کیا فرق ہے۔ ننھے کے لئے کس وضع کے زری بوٹے کا کمخواب چاہئے وہ تو جاپانی پٹوے والا سلک لالا کر پریشان کرتا رہے گا۔ بزازہ کوئی کوس دو کوس تو ہے نہیں کہ پاؤں دکھ جائیں گے آخر یہاں گھر میں بیٹھے بیٹھے کون سا پہاڑ ڈھایا جا رہا ہے، کپڑے کی خریداری میں روزہ بھی بہل جائے گا۔ اب روزہ رکھنے نہ رکھنے کا سوال ہی نہیں رہا روزہ سے ہوں یا نہ ہوں مگر بیگم کے حکم کے مطابق مارواڑیوں کی دوکان پر روزہ بہلانا ضروری اور اس پر یہ تاکید حکم کہ کسی دکان سے بخشو کے معرفت پسند کے لئے کپڑے بھجوانے سے کام نہیں چلے گا بلکہ خود بھی ساتھ آنا لازمی ہے اور اس کی معقول وجہ یہ بتلائی گئی کہ عورتوں کی نظر ہی کیا۔ ایسا نہ ہو کہ قیمت نہ معلوم ہونے کی وجہ سے دھوکہ سے کوئی معمولی کپڑا پسند کر لوں۔

ایک مجھی پر کیا موقوف ہے ایسے ایسے لیڈر جو اپنی پر زور تقریروں سے جلسوں میں ہنگامہ کر دیتے ہیں اور اسٹیج پر شیر کی طرح گرج کر سامعین کو مرعوب کر دیا کرتے ہیں وہ بھی لیڈر ائن کے سامنے لومڑی یا گربہ مسکین کی صورت اختیار کر لینے پر مجبور ہیں تو میں کا لیڈر یا لیڈر کا شوربہ، بیگم کے سامنے میری کیا حقیقت تھی حکم حاکم مرگ مفاجات حسب ارشاد بزازہ سے مختلف وضع مختلف فیشن کی ساڑیاں دوپٹے وغیرہ لیتا ہوا حاضر دربار ہوا۔ لیکن اس کا رنگ ٹھیک نہیں اس کی وضع مہمل، اس کی بیل خراب، اس کی بوٹی بدنما کہہ کر سب کے سب نامنظور۔ دوبارہ اس سے بھی زیادہ فینسی کپڑے ساتھ لے آیا مگر کل مسترد، پھر بزازہ پہنچا اور اب کے بخشو کے علاوہ اور مزدوروں پر ایک پوری دکان اٹھوا لایا۔ آخر بہ مشکل ان میں سے ننھے کی قمیض اور شیروانی کے کپڑے پسند کئے گئے۔ غرض دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد پسند کے ڈیڑھ گز کپڑے لانے کا حکم صادر فرمایا گیا۔ اب دکاندار صاحب ہیں کہ اتنے سے کپڑے کے لئے پورے

تھان کی بیونت خراب کرانے پر راضی نہیں بلکہ اور بگڑ کر کہا دن بھر خود بھی حیران ہوئے اور مجھے بھی پریشان کیا۔ معاف کیجئے میں آپ کے ڈیڑھ گز کپڑے کے لئے پورا تھان برباد نہیں کر سکتا۔ میں نے منت سماجت سے کہا بھائی چونکہ دن صرف بارہ ہی گھنٹے کا ہوتا ہے اس لئے زیادہ کپڑے پسند کرانے کے لئے کافی وقت نہیں مل سکا۔ اگر میری اور تمہاری زندگی قائم ہے تو پھر کل تمہارا سودا اور بکوانے کی کوشش کروں گا۔ آخر ہزار منتوں اور خوشامد کے بعد دونوں تھانوں سے ٹکڑے پھاڑ پھاڑ کر دئے۔ میں خوش خوش گھر پہنچ کر بیگم کے حوالے کر کے خدا کا شکر بجالایا کہ آج کی محنت ٹھکانے لگی۔ میں تو سمجھے ہوئے تھا کہ رمضان ختم ہوا عید آ رہی ہے اب رمضان کی مصیبتوں سے نجات ملے گی لیکن عید تو رمضان سے بڑھ کر جان کی جنجان نکلی۔ یہ عید کے کپڑوں کی خریداری عید کی مصیبت کا پہلا دن تھا۔

دوسرے دن حضور بیگم صاحب کے کپڑوں کی خریداری کے سلسلے میں بزازہ میں بہلانا ضروری تھا۔ بچے کا کپڑا پسند کرانے میں جب پورا دن صرف ہوا تو اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ خاص سرکاری خریداری کے لئے کتنے دنوں کی ضرورت تھی۔ مسلسل دو تین بزازہ سے گھر اور گھر سے بزازہ اس طرح آمد و رفت کا سلسلہ رہا کہ سڑک کے گرد پاجامہ کی گوٹ بن گئی۔ بار بار اس طرح آتے جاتے دیکھ کر دو دو دوستوں نے پوچھا بھئی کیا کوئی کپڑے کی تجارت شروع کی ہے، یا کسی مل کی ایجنسی لی ہے؟ میں نے کہا جی ہاں کچھ دنوں سے لیڈی اینڈ کمپنی کے آڈر سپلائی کا کام مل گیا ہے دعا کیجئے کہ خیر خوبی سے انجام پا جائے۔ محنت وجانفشانی اور نیک نیتی کے ساتھ جو کام کیا جائے اس میں ضرور کامیابی ہوتی ہے۔ چنانچہ خریداری کی کاوش اور جدوجہد میں جس خلوص کے ساتھ بازار کی خاک چھانتا رہا تھا یہ ریاضت بیکار نہ گئی تھی۔

خدا کے فضل سے دو ہی روز کی لگاتار دوڑ دھوپ میں ساڑیاں، دوپٹے وغیرہ پسند کرانے میں کامیاب ہو گیا اور عید کی ایک بڑی مصیبت سے نجات مل گئی۔ اس کے بعد بیگم کی جوتیاں، ننھے سلمہ کے لئے زری کی ٹوپی، رومال، پیتابا وغیرہ متفرقات کی خریداری میں دن بھر بازار کا چکر لگاتا رہا۔ ۲۹ تاریخ رمضان تک ان کل مہموں کو سر کر لیا۔ بیگم نے اپنے اور اپنے بچوں کے لئے دنیا بھر کی فرمائشیں مجھ سے تعمیل کرائیں مگر اتنی توفیق نہ ہوئی کہ میرے لئے اور کچھ نہیں تو کم سے کم ایک عدد نیا ازار بند ہی فہرست

میں لکھوادیتیں مگران سے کہے کون کل احکام کی تعمیل کے بعد میں خوش خوش بیگم کے پاس پہنچ کر عرض پرواز ہوا کہ اب تو کوئی اور نیا حکم تو نہیں۔ مسکرا کر بولیں کہ سب ٹھیک ہے لیکن ابھی تک ننھے کے کپڑے سل کر درزی کے یہاں سے نہیں آئے۔ دوڑا ہوا خلیفہ جی کے پاس پہنچا اور بگڑ کر کہا۔

میں : کیوں خلیفہ! ۲۸؍رمضان کا وعدہ تھا۔ آج ۲۹؍ہوگئی اور یہ بھی تمہیں معلوم ہے اب کے چاند ۲۹؍کا ہے۔

خلیفہ جی : آپ کو غلط خبر ملی ۳۰؍کا چاند ہوگا آج اور کل ابھی دو روزے باقی ہیں۔

میں : ارے بھائی جنتریوں میں تو انتیس ہی کا چاند لکھا ہوا ہے۔

خلیفہ جی : جنتریوں کا کیا اعتبار۔ ابھی اتنے سارے کپڑے سی کر گاہکوں کو دینے ہیں زبردستی ۲۹؍کا چاند ہو جائے گا۔

میں : اور اگر آج ہوگیا تو؟

خلیفہ جی :اور نہیں ہوا تو؟

میں : یار تمہیں دل لگی سوجھی ہے اور یہاں ساری کی کرائی محنت مٹی میں مل جائے گی۔ میرا اپنا خاص کپڑا ہوتا تو آج نہ دیتے یا ہضم ہی کر جاتے تو کوئی پرواہ نہ تھی، مگر ہیں یہ کپڑے بیگم صاحبہ کے نور نظر کے اگر تم لنڈورے نہیں ہو تو سمجھ سکتے ہو میں کس مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔

خلیفہ جی : اچھا صاحب آج چاند بھی ہوگا تو شب کو سی کر تیار رکھوں گا صبح سویرے آکر لے جایئے گا۔

اتفاق سے اسی روز ۲۹؍کی شام کو چاند نے روزہ داروں کو اپنے ہلالی ابرو سے اشارہ کر کے بتلا دیا کہ مہینہ بھر کی تمہاری یہ نفس کشی مقبول، تمہارا ایثار کامیاب اب زیادہ قربانی کی ضرورت نہیں جاؤ اور خوش خوش کھاؤ پیو ادھر ہلال نے بھوک ہڑتال کے خاتمہ کا اعلان کیا، ادھر خلیفہ جی کی دکان پر میں ستیہ گرہ کے ارادہ سے جا موجود ہوا اور کہہ دیا کہ اب بغیر سلے ہوئے کپڑے لئے ٹلنے والے کو بھی کچھ کہتے ہیں۔ وہ کوئی دوسرے مہاتما قسم کے لوگ ہوں گے کہ اپنے پختہ عزم کے اعلان کے بعد بغیر پورے ہوئے ستیہ گرہ سے باز آجائیں۔ یہ کوئی لیڈر اور سلطنت کے درمیان کا قصہ نہیں، یہ لیڈر اور ہوم منسٹر کے تعلقات کا معاملہ

ہے۔ دیکھو خلیفہ جی ذرا بھی پہلوتہی کی تو اس جھگڑے کو خلافت کانفرنس میں پیش کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا اور واقعی میں ارادہ کر چکا تھا کہ چاہے ساری رات ہی کیوں نہ بیٹھنا پڑے مگر بغیر کپڑا لئے یہاں سے ٹلوں گا نہیں۔ سمجھوں گا کہ شبینہ ہی میں پھنس گیا تھا۔ آخر یہ گیدڑ بھبکیاں بیکار نہ گئیں اور شب کے دس بجتے بجتے ننھے سلمہ کا جوڑا تیار کرا کے بیگم کے پاس آکر فخریہ کہا کہ جس کام کے پیچھے جان دھو کر میں پڑ جاؤں مجال ہے کہ وہ ادھورا رہ جائے۔ آخر خلیفہ جی کے یہاں سے ننھے کا جوڑا سلوا کر لے ہی آیا۔ بیگم نے لاپروائی کے ساتھ کہا بچہ کا سلوا کر کیا آئے گویا بڑی مہم سر کی۔ میں نے کہا جی ہاں عید کی شب کو درزی کے یہاں سے بغیر حجت وتکرار کے کامیاب آنا گویا کوئی بڑا کام ہی نہیں۔ ذرا بھی غفلت کرتا تو کل عید کی صبح کو بگڑنے کے لئے مجھے ڈھونڈتی ہی رہتیں۔ جی کا سارا غصہ جی میں رہ جاتا اور کہتی ہیں کہ کوئی کام نہیں کیا۔ خیر وہ میری تعریف کرتیں یا نہ کرتیں مجھے تو اس کی خوشی تھی کہ خدا نے عید کی مصیبتوں سے بغیر تھکم فضیحتی کے نجات دلا دی۔

اب تک یہ بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی کہ روزہ داروں میں سے کچھ تو عید کی خوشی اسی لئے مناتے ہیں کہ خدا نے ایک اہم فرض کی ادائیگی میں آخر تک ثابت قدم رکھا اور کچھ اس لئے کہ سر سے رمضان کی بلا ٹلی لیکن روزہ نہ رکھنے والے جو عید کی خوشی مناتے ہیں اس کی وجہ سوائے اس کی اور کیا ہوسکتی ہے کہ عید کی فرمائشوں کی تعمیل میں جو مصیبتیں اٹھانا پڑتی ہیں اس سے کچھ دنوں کے لئے چھٹکارا مل جاتا ہے اور ان مصیبتوں سے نجات پانے پر آدمی جس قدر خوشیاں منائے کم ہے۔ چنانچہ یہ خاکسار خادم ان پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کی خوشی میں عید کی صبح سویرے غسل کر کپڑے بدل جامع مسجد جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ایک مولانا کے وعظ میں سنا تھا کہ عید میں غسل کرنا، صاف ستھرے کپڑے پہننا، خوشبو لگانا سنت ہے۔ ایک تو فرض اور واجب کی ادائیگی میں غفلت ہوئی۔ اب اگر ایسی مفید کار آمد سنتوں پر بھی عمل نہ کرتا تو دینا کیا کہتی۔ غرض بہتر سے بہتر کپڑے پہن اور خوشبو سے جسم کو معطر کر اس غلو کے ساتھ اس کی سنت پر عمل کیا کہ سرے سے پیر تک سنت ہی سنت بن گیا۔ مختصر یہ کہ آراستہ و پیراستہ ہو کر عید کی نماز کی اجازت کے لئے حویلی کے اندر پہنچا۔ جاتے ہی بیگم نے فرمایا کہ ننھے سلمہ بھی کپڑے بدل کر آپ کے ساتھ جانے

کے لئے تیار ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ دوگانہ ادا کر کے اسی طرف سے دوستوں کے یہاں سے ہوتا ہوا سب سے ملتا جلتا گھر واپس آؤں گا۔ اب یہ صاحبزادہ سلمہ جو گلے منڈھے جا رہے ہیں انہیں کہاں کہاں ڈھوتا پھروں گا۔ سر کھجاتے ہوئے دبے لفظوں میں کہا کہ شادی وغیرہ کی تقریب ہو یا کہیں ناچ گانے کی محفل ہو تو تماشہ دکھانے کے لئے ساتھ لے جانے میں مضائقہ نہیں تھا۔ عیدگاہ میں سوائے بھیڑ اور شور ہنگامہ کے رکھا کیا ہے۔ ایسے ہنگامہ میں بھیج کر بچے کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے، آئندہ جیسی مرضی اتنا کہنا گویا بھیڑ کے چھتے کو چھیڑنا ہو گیا۔ بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔ ''وہ تو میں پہلے ہی سمجھے ہوئی تھی کہ بچے سے آپ کو للہی بغض ہے۔ کون بدنصیب بچہ آج ایسا ہو گا کہ باپ کی گود میں یا اس کی انگلی تھامے اچھلتا کودتا عیدگاہ نہ جا رہا ہو۔ آج غریب سے غریب بھی نئے کپڑوں میں اپنے نور نظر کو اتراتا دیکھ کر خوشی سے مالا مال ہو گا مگر واہ رے پتھر کا دل گود میں لے کر پیار کرنا تو درکنار عیدگاہ تک ساتھ لے جانے میں مصیبت ہو رہی ہے۔'' میں نے دیکھا کہ آواز کی تیرینیت میں رفتہ رفتہ کچھ تلخی کے آثار پیدا ہونے لگے ۔فوراً دھیما کرنے کے لئے کہا میں تو یوں ہی مذاقاً ایک خیال ظاہر کیا تھا ورنہ آج تک آپ کے حکم کے خلاف ورزی کبھی کی ہے مجبوراً ساتھ لیجانے کے لئے ننھے سلمہ کو یہ کہتے ہوئے چمکار کر بلایا۔ آیئے قبلہ ! کیوں ناحق باتیں سنوا رہے ہیں۔ ہنستے ہوئے دوڑ کر وہ نزدیک پہنچے اور میں نے گود میں اٹھا لیا۔ مارے خوشی کے گردن سے چمٹ گئے۔ خلاصہ یہ کہ بادل ناخواستہ اونٹ کے گلے میں بلی کی طرح اپنے سلمہ کو ساتھ لئے جامع مسجد پہنچا۔ مسجد کی سیڑھیوں پر جیوں ہی قدم رکھا دیکھا امام صاحب اللہ اکبر کہہ کر تحریمہ باندھ چکے ہیں۔ فوراً جوتا اتار کر بخشو کے حوالے کیا۔ نماز شروع ہو چکی تھی، وضو جا وقت کہاں تھا جلدی سے لپک کر ایک صف کے کنارہ بغل میں نور چشم سلمہ کو کھڑا کر کے شریک ہو گیا۔

آپ جانتے ہیں کہ میں سنیما کا بے حد شائق ہوں، اس قدر شائق کہ بعض پسندیدہ فلموں کو ہفتوں مسلسل دیکھتا رہتا ہوں۔ جب اس کی بہت سی باتیں یاد نہیں رہتیں تو سال بھر میں ایک بار عید کی نماز کی نوبت آتی ہے اس کے متعلق کہاں تک آدمی یاد رکھے کہ اس میں اتنی تکبیریں ہوتی ہیں۔ اس طرح نیت کی جاتی ہے اور یہ پڑھا جاتا ہے اس لئے جو نیت امام کی وہ میری کہہ کر تحریمہ باندھ لیا ابھی دونوں ہاتھ

ایک دوسرے پر رکھ کر تحریمہ کو کس کر مضبوط باندھا بھی نہیں تھا کہ پیش امام صاحب اور ساتھ ہی اس کے مکبر کی اللہ اکبر کی آواز کان میں پہنچی جھٹ رکوع میں چلا گیا۔ اب جو رکوع میں جھکا ہوا کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوں تو میرے سب کے سب جیوں کے تیوں کھڑے ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ اللہ امام صاحب نے کیا دھوکا دیا یہ اغل بغل والے میری اس حرکت پر کیا سمجھتے ہوں گے مجبوراً مجھے بھی اپنا یہ رکوع واپس لینا پڑا اور فوراً پھر سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا۔

نماز میں بھولی باتیں بہت جلد یاد آ جاتی ہیں چنانچہ اس وقت مجھے یہ بات یاد آ گئی کہ پارسال عید کی نماز میں امام صاحب نے رکوع اور سجدے کے علاوہ بہت ہی فاضل تکبیریں بھی کہہ ڈالی تھیں۔ رکوع کی تکبیر سمجھ کر میں جھک گیا تھا یقینی انہیں مد فاضل والی تکبیر میں سے کوئی ہوگی لیکن اب یہ یاد نہیں کہ شروع بیچ یا آخر میں کب کب اور کتنی تکبیریں کہتے ہیں۔ پھر کہیں ایسی ہی الٹ پلٹ حرکت نہ سرزد ہو جائے۔ اس لئے نیچی نظروں سے ادھر ادھر کا جائزہ لینا شروع کیا کہ کوئی نمازی وضع یا مولوی صورت کا آدمی بغل میں یا آگے والی صف میں ہو تو کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کر اس بکھیڑے سے کسی طرح چھٹکارا حاصل کروں۔ خدا عجیب مسبب الاسباب ہے بائیں جانب دو آدمیوں کے بعد ایک بزگانہ قطع کے آدمی اسی صف میں شریک تھے۔ چنانچہ منہ طرف قبلہ اور خیال طرف ننھے سلمہ تھا ہی اب نیچی نگاہ طرف ایک نمازی کے ہونا بھی اس عید کی نماز کا ضروری رکن بن گیا۔ باقی رہی نیت تو ہمیشہ سے جیسی تھی ویسی رہی۔ المختصر پوری نماز میں بغل والے نمازی صاحب کی حرکتوں کو دیکھتا رہا۔ تکبیروں میں انہوں نے کان تک ہاتھ اٹھایا میں نے بھی اٹھایا انہوں نے ہاتھ چھوڑ دیا میں نے بھی چھوڑ دیا۔ انہوں نے پھر تحریمہ باندھا میں نے بھی ہاتھ باندھ لیا وہ رکوع میں جھکے میں بھی جھکا۔ وہ سجدے میں گئے میں بھی گیا ''غرض آنچہ مردم می کنند بوزینہ ہم'' کا پورا مصداق بنا ہوا دل میں کہہ رہا تھا کہ کس جھنجھٹ میں آ کر پھنس گیا۔ اسی طرح ایک رکعت ختم ہونے کے بعد دوسری رکعت کے سجدے میں گیا ہی تھا کہ خدا جانے مانوس جگہ اور اجنبیوں کو دیکھ کر کچھ خوف طاری ہوا یا گھر یاد آ گیا۔ ننھے سلمہ لگے پہلے ٹھنکنے پھر بلکنا شروع کیا رفتہ رفتہ زور سے چلا کر رونے لگے۔ یہاں تک کہ اس اللہ کے بندے نے اپنی چیخ کی آواز سے پوری مسجد سر پر اٹھا لی۔ اب

چپ کون کرے میں تو خود نماز کی مصیبت میں پھنسا ہوا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے نماز ختم ہوئی سلام پھیرتے ہی جس وقت انہیں گود میں اٹھا کر گھر بھیجنے کے لئے بخشو کو حوالے کرنے کی غرض سے مسجد کے پھاٹک کی طرف چلا۔ دیکھا کہ نمازیوں کے پورے مجمع کا مرکز توجہ بنا ہوا ہوں۔ ہر شخص گردن پھیرے ہوئے مسکرا کر میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نیچی نظر کئے ہوئے بخشو کے ہاتھ سے اپنا جوتا لے کر بچے کو اس کے حوالے کرنے کے بعد حوض کے کنارے جلدی سے جوتا رکھا اور پھر آ کر دعا میں شریک ہو گیا۔ دعا سے فرصت پاتے ہی بے تکلف دوستوں کے علاوہ بہت سے بے جانے پہچانے آدمیوں نے پاس آ کر بتانا شروع کیا کہ اتنے چھوٹے بچے کو ساتھ لا کر تم نے کیا حماقت کی۔ میں نے کہا خود بچہ ہی جب ایک حماقت کا نتیجہ ہو تو ایک حماقت کے گزرنے کے بعد اب جتنی حماقتیں نہ سرزد ہوں کم ہیں۔ ایک صاحب نے طنزاً کہا اتنے کمسن لڑکے کو نماز میں شریک ہونے کی ضرورت ہی کی تھی۔ میں نے کہا اس قصہ کو جانے بھی دیجئے نادان بچہ تھا عید میں غلطی سے دیکھنے چلا آیا۔ مجھے بھی کبھی آپ نے عید کے سوا یہاں دیکھا ہے۔ ایک حضرت نے ذرا روکھے تیور سے پاس آ کر کہا آپ کے لڑکے نے چیخ چیخ کر سب کی نماز خراب کر دی۔ اس پر مجھے غصہ آ گیا، میں نے بگڑ کر کہا کہ نماز میں رقت طاری ہونے پر گریہ و بکا کرنے کے لئے کیا عمر کی بھی قید ہے اس کا جواب جب کچھ نہ ہو سکا تو طنزاً کہنے لگے جی ہاں ایک آپ ہی اپنی رقت قلب سے تصوف کے مدراج طے کر چکے دوسرے اب آپ کے نور نظر سلمہ نے اس کی طرف توجہ کی ہے۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ ع

اگر پدر نہ تو اند پسر تمام کند

یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے اس میں تعجب کی کون سے بات ہے۔

وہ تو خیریت ہوئی کہ امام صاحب نے عید کا خطبہ شروع کر دیا ورنہ خدا جانے اور کیا کیا مجھ پر آوازے کسے جاتے اور میری بھبتیاں اڑائی جاتیں۔ ادھر سننے کے لئے لوگوں نے سمٹ کر منبر کی طرف رخ کیا ادھر میں نے سوچا کہ اب ٹھہرنا مصلحت کے خلاف ہے ،لوگوں کو پھر مضحکہ اڑانے کا موقع دینا حماقت سے خالی نہیں۔ چپکے گھر چل دینے کے ارادہ سے جوتا لانے کے لئے جو حوض کے پاس

پہنچا تو جوتا غائب۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون، یہ عید کی مصیبت تو جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئی ادھر ادھر تلاشی کرنے کے بعد مایوس ہو کر سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے ننگے پاؤں گھر جانے سے رہا اور پھر جوتے کی گمشدگی کی خبر سن کر لوگوں کو اور بھی دل لگی کا سامان ہاتھ آ جائے گا۔ مسجد کے بیچ والے پھاٹک کی سیڑھی پر معمولی سا جوتے کا ایک جوڑا پڑا تھا اس پر نظر پڑتے ہی ذہن میں یہ بات آئی کہ کیوں نہیں اسے پہن کر گھر چل دوں۔ جب تک خطبہ ہوگا اتنی دیر میں بخشو کی معرفت واپس بھیج کر اسی جگہ رکھوا دیا جائے گا۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوگی، تجویز معقول تھی اس پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھاٹک کے پاس آ کر جلدی سے جوتا پہن سیڑھیوں کو جلد جلد طے کر کے سڑک پر آنا ہی چاہتا تھا کہ ایک خاں صاحب قسم کے آدمی صحن سے لپکے ہوئے میرے نزدیک پہنچ کر زور زور سے چلانے لگے حضرت! یہ کیا حرکت ہے، یہ میرا جوتا ہے۔ لاحول ولاقوۃ شریفوں کی سی صورت اور یہ کرتوت، جوتے بھی چرانے تھے تو عید میں ایک سے ایک قیمتی اور خوبصورت نئے جوڑے پہن کر لوگ آئے ہیں، مجھ غریب کے پرانے جوتے پر کیوں نظر انتخاب پڑی۔ میں جواب کیا دیتا، کھسیانی صورت بنا کر خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا معاف کیجئے گا میرا جوتا بھی بعینہ اسی قسم کا تھا میں نے اچھی طرح غور نہیں کیا اور غلطی سے اپنا جوتا سمجھ کر پہن لیا۔ خاں صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا غلطی کی ایک ہی کہی دو انچ ڈھیلا جوتا پہنے کے بعد بھی آپ کو اپنے ہی جوتے کا شبہ رہا۔ لوگ چونکہ خطبہ سننے میں مشغول تھے اسی لئے صرف دو چار ہی آدمیوں نے خاں صاحب کی باتوں کو سنا اب اس کے سوا اور چارہ کیا تھا کہ جوتا خاں صاحب کے حوالے کرنے کے بعد مسجد میں آ کر لوگوں کے پیچھے چپکے بیٹھا ہوا میں بھی خطبہ سنتا۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت پر غصہ بھی آ رہا تھا اور افسوس بھی، میں نے فیصلہ کر لیا کہ مسلمان کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ یہ تنزلی بے وجہ نہیں ہے آپس کی ہمدردی اور اخوت ہی غائب ہو تو ترقی کیا خاک کریں گے۔ اتنے بڑے مجمع میں دن دہاڑے میرے جوتے کی چوری کا اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور پورے مجمع میں کسی کو احساس تک نہیں اور نہ اتنی توفیق کہ تھوڑی دیر کے لئے اپنا جوتا عاریتاً ہی دے کر اسلامی ہمدردی کا ثبوت دیں اور تو اور یہ بڑی مسجد کے امام صاحب کہلاتے ہیں اور اتنا خیال نہیں کہ ایک مقتدی بے چارہ بغیر جوتے کے گھر جانے سے معذور ہے اور بے

دست و پا ہے بے یار و مددگار عید کو رو رہا ہے میں اپنے سے زیادہ مسلمانوں کی حالت پر افسوس کر رہی رہا تھا کہ امام صاحب کی زبان سے خطبہ کے تمت بالخیر والا جملہ اعلیٰ واولیٰ سنا۔ ابھی یہ جملہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پورا مجمع ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑا، بے طرح آپس میں گتھم گتھی، لپٹا لپٹی شروع ہوگئی۔ جس کے ہاتھ جو آ گیا پکڑ کر زوروں سے دھر دابا۔ کچھ لوگوں نے مجھ پر بھی حملہ کیا اور زبردستی بغل میں ہاتھ دے کر لگے دبوچنے۔ جوتے کے غم کی وجہ سے دل بھرا ہوا تھا ہی جب کوئی بغل گیر ہوتا جی چاہتا کہ اپنی اس تازہ مصیبت پر خوب گلے مل کر روؤں مگر ضبط سے میں نے کام لیا۔ مسجد میں دھما چوکڑی اور ادھم مچانے کے بعد جب پورا مجمع ایک ایک کر کے اپنے گھر روانہ ہو گیا تو تھوڑی دیر کے لئے عاریتاً ایک جوڑا جوتا مانگنے کی غرض سے امام صاحب کے حجرہ میں حاضر ہو کر اپنی مجبوری اور بے دست و پائی کا دکھڑا کہا۔ امام صاحب نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب خدا کے گھر سے جوتا غائب ہوا ہے تو خدا آپ کو ایک ایک جوتے کے عوض ستر جوتے کا ثواب دے گا۔ میں نے دست بستہ عرض کی کہ میں اس ثواب کو حضور کی نذر کرنے کو تیار ہوں، آپ نے بیسوں غریبوں کی مدد کی، سینکڑوں مسافروں کا کام نکالا ہے مجھ بے دست و پا کو بھی اپنے گھر تک پہنچنے کی کوئی سبیل نکال دیں یعنی کسی آدمی کو بھیج کر کرایہ گاڑی منگوادیں یا کوئی معمولی سا جوتا ہی تھوڑی دیر کے لئے عنایت فرمائیں، گھر جا کر فوراً واپس کر دوں گا۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ عید میں گاڑی ملنی مشکل ہے، باقی رہا جوتا تو خیر استنجا خانہ وغیرہ جانے کے مصرف کا وہ سامنے میرا جوتا پڑا ہے شوق سے لے جایئے۔ اب جو نزدیک اسے جا کر دیکھتا ہوں تو ان میں سے ایک تو پرانا سلیپر تھا جس کی ایڑھی کا کچھ حصہ گھس کر غائب ہو چکا تھا دوسرا ایک ٹوٹے ہوئے پمپ کی ایڑی کاٹ کر اس سلیپر کا جوڑا بنایا گیا تھا۔ اگر چہ امام صاحب کا یہ تبرک پاؤں میں پہنے کے عوض سر اور آنکھوں پر رکھنے کی چیز تھی مگر مجبوری سب کچھ کراتی ہے۔ اس میں پاؤں ڈال کر یا پاؤں میں اسے ڈال کر گھسیٹتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں منچلوں کی اس عجیب الہیت زیرپائی کو نظر پڑی تو ہر طرف سے تمسخر انگیز، مضحکہ خیز پھبتیوں کی بوچھار شروع ہوگئی۔ ایک نے کہا جناب میوزیم سے کیا اٹھا لائے؟ دوسرے نے گلفشانی کی کہ قبلہ ایسے قیمتی جوتے کی کیوں مٹی خراب کر رہے ہیں، اسے تو عید سے بڑھ کر کسی اور بڑی تقریب کے موقع

پر نکالنا تھا۔ تیسرے نے فرمایا کوئی جوکر معلوم ہوتا ہے۔ جوکر کا لفظ سنتے ہی شرم وغصہ کے مارے جی چاہا جوتا اتار، اور جلدی سے دونوں ہاتھوں میں لئے آنکھ بند کر کے یا علی کا نعرہ لگانے کے ساتھ بے تحاشہ سرپٹ دوڑ کر گھر پہنچ جاؤں۔ مگر پھر سوچا کہ پیچھے سے لینا، لپکنا، دوڑنا جانے نہ پائے گا اور بلّا ہو جائے گا۔ مجبوراً لوگوں کی طنزیہ جملے، مضحکہ خیز فقرے، تمسخر انگیز پھبتیاں سنتا اور جلد جلد قدم اٹھانے کے باعث راہ میں بار بار امام صاحب کا تبرک جو پاؤں سے نکل کر علیحدہ ہو جاتا اس کو سنبھالتا اور عید کو دعا دیتا بصد خرابئ بسیار گھر پہنچا۔ وہاں دیکھا کہ کئی احباب عید ملنے کے لئے پہلے ہی سے کمرہ پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ عید مبارک اور معانقہ بازی کی رسم ادا کرنے کے بعد فوراً ہی انہوں نے سویوں کی فرمائش کر دی۔ میں نے کہا جلدی کیا ہے ابھی تو آ رہا ہوں ذرا اطمینان ہو لینے دو تو اندر سے منگواتا ہوں۔ مگر بے تکلف کا برا ہو کہ جلدی کی رٹ لگادی۔ میں نے بگڑ کر کہا کہ تم لوگوں کو میری پریشانیوں کا ذرا بھی خیال نہیں، یہاں تو میرا جوتا غائب اور تمہیں جلدی کھانے کی فکر۔ جمیل نے اور چڑھانے کی غرض سے کہا ''جوتا غائب ہوا تو کوئی پروا نہیں ایسے ایسے بیسوں جوڑے تم پر سے صدقے کرنے کو تمہارے احباب تیار ہیں۔'' سوچا کہ جب تک یہ کچھ فرو حلق نہ کریں گے چھیڑ چھیڑ کر مجھے پریشان کرتے رہیں گے۔ ان سے چھٹکارا پانے کے لئے ''بہ لقمہ دوختہ بہ'' والی ترکیب کے بغیر کام نہیں چلے گا اس ارادہ سے اندر پہنچا کہ بیگم صاحبہ سے خود کہہ کر ذرا پر تکلف دعوت کا سامان کروں لیکن دروازہ کا پردہ اٹھاتے ہی وہاں بجائے کمیڈی (Comedy) کے ٹریجڈی (Tragedy) کا سین نظر آیا۔ بیگم صاحبہ ابرو پر بل پیشانی پر شکن ڈالے منہ لٹکائے پہلے ہی سے میرے انتظار میں بادل کی طرح بھری بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی جملوں کی بارش شروع ہوگئی۔ نہ معلوم کیوں اس معصوم بچے سے آپ کو عداوت ہے آخر اس سے بیزار ہونے کو کوئی وجہ بھی تو معلوم ہو۔ عید کی نماز میں ساتھ لیجانے کی خواہش نہ تھی تو صاف کہہ دینا تھا میں خواہ مخواہ گلے نہ منڈھتی۔ دوستوں سے ملنے جلنے ہنسی مذاق میں یہ کون سا روڑہ اٹکا رہا تھا کہ مسجد سے فوراً واپس کر کے اس سے جان چھڑائی۔ ہنستا کھیلتا ہوا یہاں سے گیا تھا اور روتا بلکتا آیا۔ میاں ننھے بھی کیا یاد کریں گے کہ ابا جان کی بدولت کیسی عید گزری۔ میں نے دل میں کہا خود ان کے ابا جان ہی کی عید جیسی

گزر رہی ہے وہ معلوم۔

میں نے سمجھا تھا کہ مسجد تک یا زیادہ سے زیادہ گھر واپس آنے تک عید کی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی مگر حویلی کے اندر آکر معلوم ہوا کہ نہیں عید ابھی باقی ہے بار بار یہی الزام کہ بخشو کے معرفت بچے کو کیوں نہیں بھجوایا، ساتھ کیوں رکھا۔ اب ان سے کیا کہتا کہ اس رقیق القلب صاحبزادے نے نماز میں رو رو کر لوگوں کی نظروں میں کس طرح میری عزت بڑھائی۔ میں نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا کہ آج عید ہے اپنے بگڑنے کو کم سے کم آج بھر ملتوی کر دیجئے اور یوں تاریخ بڑھانے کی رائے نہ ہو تو بگڑتی بھی رہئے مگر چند احباب باہر بیٹھے ہیں، ان کے لئے تو سوئیاں بھجوا دیجئے۔ مجھے تو اپنی ذلت کا خیال نہیں بلکہ آپ کی خوش سلیقگی اور عالی حوصلگی کے جو میرے احباب مداح ہیں کہیں ان کا خیال نہ بدل جائے۔ مجھے کیا میں باہر جا کر کہہ دیتا ہوں کہ میرے یہاں عید میں سوئیاں پکتی ہی نہیں۔ یوں بھی لوگ مجھے بناتے ہی رہتے ہیں اور دو چار مذاق کے جملے سن کر ہنسی میں ٹال دوں گا۔ صرف مجھے آپ کی سبکی کا زیادہ خیال ہے۔ یہ فقرہ کام کر گیا۔ خوش سلیقگی پر بٹہ نہ لگ جائے اس خیال نے ان کی ساری خفگی کو درہم برہم کر دیا گفتگو کا پہلو فوراً بدل گیا، کہنے لگیں مجھے تو آپ کی اُلوالجلول حرکت پر غصہ تھا آپ کے دوستوں سے تھوڑی مجھے کچھ رنج پہنچا ہے ان کی خاطر تواضع میں کیوں پہلوتہی کرنے لگی۔ اب مت پوچھئے لکھنؤ کی مہین سوئیاں ایک تشتری میں داد لینے کے لئے اس کے مقابل میں اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی اس سے زیادہ باریک دوسری تشتری میں، زعفرانی مطبق تیسری تشتری میں چوتھی میں سوئیوں کی فیرنی، پانچویں میں سوئیوں کا زردہ۔ صرف سوئیوں کا قلیہ اور قورمہ نہیں تھا، باقی سب قسم کی سوئیوں کی تشتریاں طشت میں قرینہ سے سج دی گئیں۔ میں اس کامیاب اور شاندار کارنامہ پر خوشی خوشی ساتھ لوائے باہر پہنچا۔ یہ من وسلویٰ زہر مار کرنے کے بعد احباب کی جب یہ بلا سر سے ٹلی تو میں نے ذرا اطمینان کا سانس لیا کہ خیر عید کی اس آخری مصیبت سے بھی نجات مل گئی۔ مطمئن ہو کر کمرہ میں گاؤ تکیہ کے سہارے قالین پر پاؤں پھیلایا ہی تھا کہ ایک حضرت عید ملنے کے لئے تشریف لائے اٹھ کر گلے گلے ملا اور کہا تشریف رکھئے۔ پان عطر ان کے سامنے پیش ہی کر رہا تھا کہ ایک دوسرے صاحب السلام علیکم کی آواز نے ادھر متوجہ کر دیا پھر اٹھ کر ان سے بھی بغلگیر ہوا۔

ادھر ادھر کی معمولی باتوں کے بعد انہیں رخصت کر کے بیٹھا ہی تھا کہ باہر ہی سے ''عید مبارک'' کی صدا کانوں میں آئی، نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو دروازہ پر معانقہ کے لئے ہاتھ پھیلائے میاں رشید کھڑے ہیں اخاہ کہتا ہوا اٹھا اور معانقہ کر کے کمرہ کے اندر بیٹھنے کی غرض سے ان کا ہاتھ کھینچا تو چونکہ اپنے تسمہ پا یعنی جوتے کے فیتہ میں ہاتھ لگانا نہیں چاہتے تھے اس لئے مجبوراً سائبان میں بیٹھ کر ان کی مصاحبت کرتا رہا۔ انہیں رخصت کر کے پھر کمرہ میں آکر اسی طرح لیٹا تھا کہ ایک اور ملاقاتی نازل ہو گئے۔ اٹھ کر انسے بھی معانقہ بازی کی۔ بار بار اسی طرح اٹھنے بیٹھنے کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا کہ عاجز آکر جی چاہا کہ ''نہ رہے بانس نہ بجے بانسری'' آج پھر گھر ہی چھوڑ دوں جب میں ہی نہیں رہوں گا تو پھر یہ اٹھ بیٹھ کی سزا کس کو دیں گے پھر سوچا کہ شاید یہ سلسلہ بند ہو لیکن ملاقاتیوں کا تانتا ہے کہ رکتا ہی نہیں اور جو آتا ہے ایک معانقہ لگا جاتا ہے۔ گویا سال بھر کا معانقہ آج ہی خرچ کرنے کا تہیہ لوگوں نے کر لیا ہے اور صرف معانقہ ہی نہیں مہمل اور فضول سوالوں سے بھی دق کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ یہ کوئی سوال میں سوال ہوا کہئے کہاں عید کی نماز آپ نے پڑھی؟ اب کون ان سے پوچھے کہ عید کی نماز عید گاہ میں یا کسی مسجد کے علاوہ کسی مندر یا گرجا گھر میں تھوڑے ہی آدمی پڑھتا ہے۔ کے بجے نماز ختم ہوئی، آخر اس بے جوڑ سوال کی غرض؟ کیا اس لئے کہ ٹھیک وقت معلوم ہو جانے پر خود پہنچ کر معانقہ بازی سے ناک میں دم کر دیں۔ عید میں جو اصلی چیز پوچھنے کی ہے اس کے متعلق کوئی سوال نہیں کرتا۔ سب سے پہلے پوچھنا چاہئے کہ عید گاہ سے خدانخواستہ آپ کا جوتا تو غائب نہیں ہوا۔

خیر یہ مہمل سوال کچھ ایسے پریشان کن نہیں سب سے بڑی مصیبت تو یہ معانقہ کی بھرمار ہے اس سے تھک کر اگر بیٹھے بیٹھے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے تو بداخلاقی کا الزام۔ آخر عاجز آکر میں پختہ ارادہ کر کے قالین پر چت لیٹ گیا اب کسی سے اٹھ کر معانقہ کرنے والے کو بھی کچھ کہتے ہیں۔ اب جو ملنے والے صاحب آئیں ان کا جی چاہے تو اسی طرح میرے سینے پر لیٹ کر معانقہ کا اخلاقی فرض ادا کر لیں۔

مجھے اسی طرح لیٹا ہوا دیکھ کر جمیل پوچھنے لگے کیوں خیریت ہے؟ میں نے کہا عید میں بھی کوئی خیریت سے رہ سکتا ہے۔ انہوں نے کہا موٹر موجود ہے چلو لوگوں سے عید مل آئیں۔ میں نے کہا ملنے والوں

نے آ کراس قدر دق کیا کہ اب جا کر دوسروں کو دق کرنے کی صلاحیت نہیں رہی مگر پھر سوچا کہ یہاں رہنے سے لوگوں کو اور پریشان کرنے کا موقع ملے گا۔خود دق ہونے سے دوسروں کو دق کرنا بہر حال اچھا ہے۔ چار بجے تک لوگ آ کر مجھے ستاتے رہے اور چار بجے کے بعد گھر گھر جا جا کر لوگوں کو پریشان کرنے میں مصروف رہا اس طرح شام کو کہیں جا کر عید کی مصیبت سے نجات ملی۔

یوں میری عید کی مصیبتوں کا لوگ مذاق اڑائیں لیکن عید کے کپڑوں کی خریداری سے اہتمام معانقہ تک اگر کُل نہیں تو ایک آدھ مصیبت میں ہر شخص کو میرے شریک حال ہونے کا ضرور موقع ملا ہوگا۔

(''ندیم'' جنوری 1934ء)

خـــتم شـــد